راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 18واں سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly

Arxang

Lahore

مدیر اعلیٰ : عامر بن علی

مدیر : حسن عباسی

جولائی 2017ء

چشمِ ماروشن دلِ ماشاد

ہم عید ملن مشاعرہ میں شرکت کے لیے تشریف لانے والے
تمام شعراء کرام کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے

خوش آمدید

کہتے ہیں

منجانب : **چوہدری ندیم اختر**

چیئرمین وارا کین بلدیہ۔ میاں چنوں

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 19 • جولائی 2017ء • شمارہ نمبر 7

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{ مجلس ادارت }

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک
◉ لیلیٰ صفدر

{ مجلس مشاورت }

محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)
محمد ادریس لاہوری (ناروے) ◉ ڈاکٹر سید ندیم حسین (ناروے) ◉ نازاوکازوی

کمپوزنگ • زرتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 ڈیزائنر • نعمان حسن :0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس • محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الحمید سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 نازاوکازوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے متعلقہ تفصیل، نام اور شناختی کارڈ پر مبلغ -/1000 روپے
بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31304-7298386-9

فہرست

● حمد ' ۲
● نعت ' ۳
● مضامین:
• ''آرٹ گیلری میں پتھوون کی چاندنی راتیں''/ مستنصر حسین تارڑ ' ۴
• احمد عقیل روبی / خورشید رضوی ' ۱۸
• اُردو غزل......اقبال کے فوراً بعد / خاور اعجاز ' ۲۰
• صنفِ نازک کون؟ / ڈاکٹر انور محمود خالد ' ۳۳
• اُردو کے پھیلتے عالمی دائرہ / ڈاکٹر مختار عزمی ' ۳۵
• ارژنگ کا ارتقا / عامر بن علی ' ۳۷
• عمران اور خواب / نازاوکازوی ' ۳۹
● طنز و مزاح سینئر گدھے / عطاالحق قاسمی ' ۴۱
● شعری گوشے: مومن خاں مومن/ صائمہ نورین/ سرفراز زاہد ' ۴۳-۴۵
● افسانے:
• اندر کا رنگ / نیلم احمد بشیر ' ۴۶
• نرگسِ بیمار / شبہ طراز ' ۵۰
• خاکدان / ایوب صابر ' ۵۳
● سفرنامے:
• سبز گلاب / عامر بن علی (جاپان) ' ۵۸
● مختصر ادبی خبریں ' ۶۰
● تبصرۂ کتب ' ۶۱
● نامہ ہائے احباب ' ۶۳

+ + + + +

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد

ملے حکم سفر نیلے سمندر کی ہواؤں کو
الٰہی! سن مری بنجر زمیں کی التجاؤں کو
مرے سجدوں میں شامل ہے مری آنکھوں کی حیرانی
قبولیت کا حاصل ہو شرف میری دعاؤں کو
تشکر کے لیے اک لفظ بھی موزوں نہیں ملتا
ترے در پر میں لے آیا ہوں تیری ہی عطاؤں کو
غبار شہرِ طیبہ میں ملے جھرمٹ ستاروں کا
غبار شہرِ طیبہ دے فلک کی کہکشاؤں کو
ہواؤ! لے چلو انگلی پکڑ کر خلدِ طیبہ میں
تلاشِ امن میں نکلی ہوئی ان فاختاؤں کو
زمیں پر بسنے والوں میں ہے بے چینی سی بے چینی
زمیں میں دفن کر دے یا خدا! جھوٹے خداؤں کو
مرے اندر کا انساں قصرِ شاہی سے کبھی نکلے
نیاز و عجز کا موسم ملے میری اناؤں کو
ہر اک منظر ہوس کی آگ میں جلنے لگا یارب!
ہدایت آسمانی دے ہمارے رہنماؤں کو

ریاض حسین چودھری

حسنِ طلب کو وقفِ قلم کر رہا ہوں میں
توصیفِ کردگار رقم کر رہا ہوں میں
تقسیم کر دیا تھا مجھے وقت نے مگر
تیرے کرم سے خود کو بہم کر رہا ہوں میں
ہر گام ہو رہی ہیں مجھے رفعتیں نصیب
ہر جا بلند تیرا علم کر رہا ہوں میں
روزِ ازل سے شام و سحر اے مرے کریم
تیرا ہی ذکر جود و کرم کر رہا ہوں میں
ممکن نہیں جو غیر کی تعظیم میں جھکوں
سر تیری بارگاہ میں خم کر رہا ہوں میں
میرے خیال و خواب کو تعبیر ہو عطا
اک عمر سے طوافِ حرم کر رہا ہوں میں
خورشید زندگی کا سفر اس کے نام سے
بے خوف سوئے ملکِ عدم کر رہا ہوں میں

خورشید بیگ میلسوی

بندہ ہوں ترا تو نے مجھے پیدا کیا ہے
جو کچھ بھی ہے میرا، وہ فقط تیری عطا ہے
مالک ہے جہانوں کا تو سب سے بڑا ہے
ہر بات پہ قادر ہے تو ہی فرماں روا ہے
رہنے کا زمانے میں ہنر تو نے دیا ہے
حاضر ہوں میں اور سر بھی ترے در پہ جھکا ہے
دھڑکن بھی ہے دل کی تو ہیں سانسیں بھی امانت
صد شکر کہ اب شکر ترا صبح و مسا ہے
حیواں ہو یا انساں وہ کرے تیری اطاعت
جن ہو یا فرشتہ وہ بھی مصروفِ ثنا ہے
پھولوں میں مہک تیری ہے تاروں میں چمک تیری
دنیا کی ہر اک چیز میں تو جلوہ نما ہے
دریا ترے کوہ و دمن صحرا بھی ہیں تیرے
ہر چیز کے ہونے میں تری رمز و رضا ہے
کلیاں نہیں کھلتی کوئی پتا نہیں ہلتا
ہاں تابعِ فرمان تری بادِ صبا ہے
یہ آفریں مشتاق ہے اب لطف و عطا کا
ناچیز بھی آ کر ترے در پر ہی پڑا ہے

رشید آفریں

وہ عدو ہو کہ یار صاحب کا
ہر کوئی زیر بار صاحب کا
ایک صندوق موتیوں سے بھرا
جب بھی کھولا انار صاحب کا
پھول نکلا ہے میرا انگلی سے
جب بھی توڑا ہے خار صاحب کا
بے قراری ہے کائنات میں کیوں
کس نے لوٹا قرار صاحب کا
لاوا آتش فشاں نے اگلا ہے
کچھ تو نکلا غبار صاحب کا
آنسوؤں کی زباں ہے سرکاری
نام رو کر پکار صاحب کا
جتنا کر سکتا ہے تماشا کر
وقت اچھا گزار صاحب کا
دکھ سے اتنا بھرا ہوا ہوں میں
کیسے جھیلوں گا پیار صاحب کا
آخری دیکھ کون ہوتا ہے
میں ہوں پہلا شکار صاحب کا

حسن عباسی

نعت

ہاشمی لفظوں کی ارزانی رہے پیشِ نظر
جب محمدؐ کی ثنا خوانی رہے پیشِ نظر
پیٹ پر پتھر بندھے، تکیہ رکھا تھا خشت کا
کون تھے وہ؟ اُن کی سلطانی رہے پیشِ نظر
سب سے آخر جن کو رب نے بھیجا وہ ختم الرسل
جن کا پھر آیا نہیں ثانی رہے پیشِ نظر
آیتِ قرآں بھی اس کی گواہی میں ملے
سجدہ داروں کی وہ پیشانی رہے پیشِ نظر
اذن مل جائے تو پیدا خود بہ خود اسباب ہوں
پھر نہ کوئی تنگ دامانی رہے پیشِ نظر
سوئے طیبہ بن بلائے کوئی جاتا ہے بھلا
جاؤ تو پھر ان کی مہمانی رہے پیشِ نظر
پیش کرنا ہے اگر ہدیہ انھیں جذبات کا
پھر عقیدت کی فراوانی رہے پیشِ نظر

سیّد انور جاوید ہاشمی

سیاہ کاری و غفلت میں اک زمانہ ہوا
تو درگزر کے لیے نعت کا بہانہ ہوا
دلِ شکستہ دیارِ حبیب کی جانب
گرہ میں اشکِ ندامت لیے روانہ ہوا
دیا ہے درسِ قناعت حضورؐ نے ایسا
کہ تنگ دستی کا مجھ کو کبھی گلہ نہ ہوا
خوشا وہ خاکِ مدینہ خوشا مکیں اس کے
جنہیں نصیب مدینے کا آب و دانہ ہوا
خطا نقصِ عمل سے میں کب نہ مضطر تھا
دلاسا رحمتِ عالم سے کب عطا نہ ہوا
بجا ہے پیری میں شاہدؔ اب اتباعِ رسولؐ
وہ عہدِ گل، وہ شباب آج اک فسانہ ہوا

صدیق شاہد

دل جو مشغولِ نعت گوئی ہو
کیوں اسے رنج و فکر کوئی ہو
جاگ اٹھتی ہے سُن کے ذکرِ حضورؐ
روح جیسی بھی نیند سوئی ہو
یوں ستاروں بھرا ہے دامنِ شب
جیسے عشقِ نبیؐ میں روئی ہو
کاش میری نگاہ بھی اک دن
اخضری منظروں میں کھوئی ہو
ایسا لگتا ہے کہہ کے نعت شہابؔ
جیسے تسبیح اک پروئی ہو

شہاب صفدر

خاتمِ روح کا طیبہ جو نگیں ہو جائے
ہم کنارِ اوج سے یہ خاک نشیں ہو جائے
ہر گھڑی نور کی بارش کا سماں ہو گھر میں
زیست گر وقفِ ثنائے شہِ دیں ہو جائے
خاکِ پاکِ درِ اقدس جو کبھی مل جائے
مجھ سا ناچیز بھی فرخندہ جبیں ہو جائے
دل کے آفاق پہ اُتریں جو نبیؐ کی یادیں
اس کی ہر راہ گزر خلدِ بریں ہو جائے
گر ہو موضوعِ سخن سیرتِ اطہر انؐ کی
اس نگوں سار کا ہر لفظ حسیں ہو جائے
اس کو مل جائے زمانے میں جناں کی دولت
جو بھی اس شہرِ محبت کا مکیں ہو جائے
جو بھی تحریر ہوا مدحِ نبیؐ میں یارب
اس گنہگار کی بخشش کا امیں ہو جائے
انؐ کی یادوں میں قمرؔ ہو جو مسلسل رم جھم
کتنی شاداب مرے دل کی زمیں ہو جائے

محمد یٰسین قمر

میری ہستی سے بڑھ کر عطا آپ کی
یہ عنایت ہے خیر الوریٰ ﷺ آپ کی
روز و شب ساتھ رکھوں خیال آپ ﷺ کا
سوچ میری ہو مدحت سرا آپ ﷺ کی
لفظ پاؤں تو ایسا قصیدہ لکھوں
مجھ کو مل جائے آقا روا آپ ﷺ کی
چاند تاروں میں ضو آپ ﷺ کے نور سے
روشنی جگ میں بدرالدجیٰ آپ ﷺ کی
پھول خالدؔ کی امید کے کھل اٹھیں
باغِ دل میں جو آئے صبا آپ ﷺ کی

یحیٰی خالد

''آرٹ گیلری میں بیتھوون کی چاندنی راتیں''

مستنصر حسین تارڑ

میں جب اس آرٹ گیلری میں داخل ہوا تھا، کتنے یگ بیت گئے۔ سب سیارے سب ستارے میرے لیے گردش کرتے تھے۔ میرے خون میں شامل رواں ہوتے دمکتے تھے۔ تب میں اس آرٹ گیلری میں داخل ہوا تھا تو اس کی دیواروں پر آویزاں تصویروں میں قدرت کے ودیعت کردہ اور انسان کے ہاتھوں سے تخلیق کردہ سارے رنگ روغن یوں بھڑکتے تھے جیسے یہ تصویریں ابھی چند لمحے پہلے تکمیل کو پہنچی ہوں۔ اگرچہ اس کی اجازت تو نہ تھی لیکن اگر چوری چھپے کسی بھی تصویر کو پوروں سے ہلکا سا بھی چھوا جاتا تو پوریں ابھی تک گیلے رنگوں سے گیلی ہو جاتیں۔ میں نے کئی بار خلاف ورزی کی۔ ادھر اُدھر تانک جھانک کر اطمینان کیا کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا اور پھر کسی ایک تصویر میں جو بھی رنگ میری آنکھوں میں گل و گلزار ہوا اُسے چھوا تو وہ میری پوروں میں سرایت کر گیا۔ یوں اکثر ہوا کہ میں نے وہی پوریں اُس تصویر کے کسی اور رنگ پر ثبت کیں تو وہ رنگ بھی منتقل ہو گیا اور یہ بھی اکثر ہوا کہ وہ ایک تصویر اپنی کاملیت کے ساتھ تمام تر رنگوں کی گیلاہٹ سمیت میری پوروں پر نمایاں ہو گئی۔ جیسے چاول کے ایک دانے پر، ایک ناخن پر کوئی دیدہ ریز مصور مونالیزا کی مسکراہٹ مصور کر دیتا ہے۔ جیسے بہزاد ''تیمور نامہ'' میں منی ایچر گھوڑے جو زندہ لگتے تھے برش اور رنگوں سے تخلیق کر دیتا تھا۔ ایسی میری پوروں پر اس آرٹ گیلری میں آویزاں کوئی تصویر نقش ہو جاتی تھی اور میں اسے گھر لے آتا تھا۔

خون میں گردش کرتے سیاروں اور دمکتے تاروں میں اسے شامل کر دیتا تھا۔ یہ تو گئے زمانوں کے قصے ہیں۔ جو زمانے خس و خاشاک ہو چکے ان کے بیان ہیں جب کہ ان زمانوں میں اس آرٹ گیلری کی دیواروں پر آویزاں تصویریں پھیکی پڑ چکی ہیں۔ سب کی سب یک رنگی ہو چکی ہیں۔ وہ رنگ جو قدرت سے مستعار شدہ اور انسانی ہاتھوں سے تخلیق کردہ بھڑکتے، شوخ اور گیلے دکھائی دیا کرتے تھے، زائل ہو چکے ہیں۔ مدھم ہوتے ہوتے معدوم ہونے کو ہیں اور ایک بجھے ہوئے پھیکے ہوتے بس ایک ہی رنگ میں اوجھل ہوتے نظر آتے ہیں۔ جہاں رنگا رنگی کے پکھیرو نظر نواز ہوتے تھے وہاں جو ایک آدھ پنچھی چونچ بند کیے معدوم ہونے کو ہے وہ بھی یک رنگا ہے۔ یہ آرٹ گیلری میرا شہر تھا۔

آج میں اسی کی دہلیز کے پار اس وسیع پارک کے ایک پتھریلے بنچ پر بیٹھا اُس شہرِ آرزو کا ماتم کرتا ہوں جس کے سب رنگ اُجڑ چکے...... پارک میں سیر کرنے والے مجھ سے کتراتے ہیں۔ ایک ماتم کدے کے قریب کون آتا ہے۔

میں ان کو جو مجھ سے کتراتے ہیں دوش نہیں دے سکتا کہ جب انہوں نے ہوش سنبھالا اس جہانِ رنگ و بُو میں آنکھ کھولی تو نہ کوئی رنگ تھا اور نہ کوئی بُو...... تب اس آرٹ گیلری کی تمام تصویریں نہ صرف مدھم ہو چکی تھیں بلکہ یک رنگ ہو چکی تھیں۔ وہ آگاہ ہی نہ تھے کہ کبھی ان تصویروں میں قوس قزح کی ست رنگی آبشاریں اُترتی تھیں۔ شوخ بھڑکتے رنگوں کے جھرنے پھوٹتے تھے وہ، اور میں انہیں دوش نہیں دے سکتا، اس یقین کے اسیر ہیں کہ تصویریں ہمیشہ سے ہی بس ایک ہی رنگ کی ہوتی ہیں۔ اگر میں انہیں کسی کرشمے سے جب میں اس آرٹ گیلری میں داخل ہوا تھا تب اس کی دیواروں پر آویزاں تصویروں کے نچڑتے ہوئے صد رنگ دکھا سکتا تو وہ اپنی آنکھوں کی گواہی کو باطل قرار دے دیتے۔ وہ ان بچھڑ چکے، معدوم ہوتے، پھیکے پڑتے معدوم ہوتے رنگوں کے وجود سے انکار کر دیتے۔ آج کی یک رنگی پر ایمان رکھتے ہوئے اسے ایک شعبدہ قرار دیتے۔

یہ صرف میں ہوں...... منیر شیخ۔ اسی کی دہلیز کے پار...... شرمندگی سے بول و براز کے لیے ایک پلاسٹک بیگ اپنے پیراہن میں پوشیدہ کیے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ایک اور آپریشن ہوگا۔ اس پارک کے ایک پتھریلے بنچ پر بیٹھا یک شہرِ آرزو کا ماتم کرتا اور گاہے گاہے اپنی انگلیوں کی پوریں تکتا جن پر اُس آرٹ گیلری کی سب تصویریں نقش ہو کر محفوظ ہو چکی ہیں۔ انہیں دیکھ دیکھ اپنے آپ میں مسکراتا، گئے زمانوں کے رنگوں میں گیلا ہوتا، مسکراتا، اگر وہ ایک ماتم کرتے کبھی کبھار بے وجہ مسکراتے بوڑھے سے اجتناب کرتے کترا کر نکل جاتے تھے تو میں انہیں دوش نہیں دے سکتا۔ میں چلنے پھرنے سے تقریباً معذور ہو چکا ہوں۔

میرا بیٹا...... اللہ اُسے عمر خضر عطا فرمائے۔ صحت، زندگی اور خوشی دے، نہ میری طویل بیماری سے بیزار ہوا ہے اور نہ ہی جب میں اُسے غصے میں آ کر ڈانٹتا ہوں بیماری اور بڑھاپے کے چڑچڑے پن سے مجبور ہو کر اُسے نالائق قرار دیتا ہوں اپنی اُلفت میں کچھ کمی نہیں آنے دیتا۔ مسکراتا رہتا ہے...... ہر سویر مجھے سہارا دے کر جب کہ میرے پاؤں نہیں اُٹھتے، گھسٹتے چلے جاتے ہیں وہ مجھے سہار کر اس پتھریلے بینچ پر بٹھا کر میری درخواست پر گھر لوٹ جاتا ہے۔

شہر کے اس مرکزی پارک میں سیر کرنے والے لوگ...... تو دو لیجئے صنعت کار جن میں سے ایک پستہ قد شخص کی شکل میں مجھے ہمیشہ ایک خچر دکھائی دیتا ہے۔ وکیل، بینکر، یہاں موسم سرما گزارنے والے امریکہ اور یورپ میں منتقل ہو چکے لوگ، کچھ ریٹائر ہو چکے ماضی کے کھلنڈرے، لوگوں میں مذہبی کتابچے تقسیم کرتے ہوئے بجلی کے محکمے کے ایک اکاؤنٹنٹ جن کی ملازمت کا بیشتر وقت معطلی میں گزرا کہ موصوف جہاں لاکھوں کی رشوت قبول کر لیتے تھے وہاں اگر کسی درخواست گزار کے ہاں محض چند مرغیاں ہدیہ کے طور پر پھڑپھڑاتی تھیں تو بھی اس کی دل شکنی نہ کرتے تھے، قبول کر لیتے تھے۔ وہ ہمہ وقت درود شریف پڑھتے دائیں ہاتھ میں لٹکی تسبیح کے دانے گراتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا دایاں بازو تقریباً ساکت ہو چکا تھا۔ ان کے سوا شوہروں کی متروک شدہ گھریلو خواتین کے علاوہ تصویر کائنات میں رنگ بھرنے والی چوڑے کولہوں اور بھاری چھاتیوں والی چند لڑکیاں بھی یہ اُڑی اُڑی سی رنگت اور بکھرے ہوئے بے گیسوؤں کے ساتھ سیر کرتی نظر آ جاتی تھیں۔ ان کے منشور میں صبح سویرے بیدار ہونا شامل نہ تھا کہ وہ سوتی ہی نہ تھیں۔ شبوں کی بیداری ہی اُن کے رزق کا وسیلہ تھی۔ تو وہ کسل مندی سے جمائیاں لیتیں بستر سے اُٹھ کر پارک میں آ نکلتی تھیں تاکہ پچھلی شب کی کثرت کا کچھ مداوا ہو سکے۔

یہ سب لوگ مجھ سے کتراتے تھے۔ اس لیے بھی کہ میں ایک پرندوں سے باتیں کرنے والا بوڑھا تھا۔ بلکہ پرندوں سے نہیں ایک پرندے سے باتیں کرنے والا بوڑھا ہوں۔ اگر میری بات سمجھنے والا کوئی نہیں رہا...... کوئی سمجھتا ہی نہیں کہ اس آرٹ گیلری کی تصویریں ہمیشہ سے یک رنگی نہیں ہیں تو میں اپنے دل کا حال ایک پرندے کو نہ سناؤں تو اور کس کو سناؤں۔

وہ ایک پرندہ...... جہاں ان دنوں یہ پارک جہاں تک نظر سفر کرتی جاتی ہے وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں بہت دن نہیں ہوئے چند پھول بوٹوں والی نرسریوں کے ذخیرے تھے اور ان کے آس پاس ایک ایسا گھنا جنگل تھا جہاں دن کی روشنی اپنے آپ کو اس کی قدیم گھناوٹ میں گم کر بیٹھتی تھی۔ اس کے اندر شب کی سیاہی کا سماں ہوتا تھا اور یہاں کے باشندے اس کے اندر قدم رکھنے سے جھجکتے تھے کہ اُس کے گھنے سناٹے میں ہوا کا ایک جھونکا بھی اُترتا تو اس میں سے عجب ماتم کناں، بین کرتی آوازیں رونے لگتیں جو اُس کے سروٹوں اور جنگلی جھاڑیوں کے ارتعاش سے جنم لیتی تھیں۔ پھر اس پارک کی منصوبہ بندی کے نقشے تیار ہوئے تو اسے ایک جدید شکل اور اونچی نیچی پہاڑیوں سے مزین کرنے کی خاطر نرسریاں اُٹھوا دی گئیں اور جنگل کے اندر جتنے بھی قدیم شجر، سروٹوں کے جھنڈ، گھاس کے ذخیرے اور گھنی جھاڑیاں صدیوں سے افزائش پذیر تھیں انہیں بل ڈوزروں نے جڑوں سے اُکھاڑ کر زمین ہموار کر دی۔ البتہ تین چار درخت ایسے تھے کہ بل ڈوزران سے ماتھا لگائے پوری قوت سے گھاں گھاں کرتے زور لگاتے رہے لیکن ان کی جڑیں اتنی گہری جا چکی تھیں، اتنی پھیل چکی تھیں کہ انہیں اکھیڑنے کے لیے پوری بستی کی زمین اُدھیڑنی پڑتی۔ ان میں سے ایک میرے پرندے والا برگد تھا۔ چونکہ میں نے اس پرندے کو کبھی دیکھا نہ تھا۔ وہ برگد کے پتوں کے گھنے پن میں کہیں پوشیدہ تھا اس لیے میں نہیں جانتا کہ وہ کس رنگ روپ کا تھا۔ لیکن یہ طے تھا کہ وہ برگد کے ایامِ جوانی میں شاید اپنی ڈار سے بچھڑ کر ایک رات بسر کرنے کی خاطر کسی شاخ پر اُترا اور پھر یہیں کا ہو رہا۔ اُسے ہرگز خبر نہ تھی کہ آس پاس کا جنگل تمام ہو چکا اور اب وہاں ایک وسیع سیر گاہ وجود میں آ چکی ہے۔

جب میرا بیٹا اللہ اسے عمر خضر عطا فرمائے مجھے اس بینچ پر بٹھا کر چلا جاتا تھا تو میں کچھ دیر بعد اپنی سکت بحال کرنے کے بعد نقاہت سے لڑکھڑاتا اپنے بوجھ کو گھسیٹتا اُس برگد تلے جا کر اُسے پکارتا تھا۔ وہ بھی منتظر ہوتا۔ میری پکار کے جواب میں ایک پُرمسرت کوک کے ساتھ غل مچا دیتا۔ اُس کی کُوک سے میرے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ پُھوٹنے لگتی جس میں بڑھاپے کے حواس باختگی کے پرتو ہوتے اور میں اُس سے باتیں کرنے لگتا۔ منہ اُٹھا کر ان دنوں کی کہانیاں کہنے لگتا جب اس شہر کی آرٹ گیلری میں آویزاں تصویریں رنگ رنگ کے رنگوں سے نچڑتی تھیں۔ آس پاس سے گزرتے، سیر کرتے، جوگنگ کرتے لوگ مجھ

پر ترحم آمیز نظریں ڈالتے ذرا بچ کر نکل جاتے۔

میرا اطاعت گزار، ہمیشہ سر جھکا کر بات کرنے والا بیٹا مجھے زبردستی شہر بھر کے مہنگے، اکثر لالچی، خودغرض اور کمینے بڑھاپے کے عارضوں کے خصوصی ماہر ڈاکٹروں کے پاس لیے پھرتا تھا۔ میرا بلڈ پریشر عمر کے لحاظ سے مناسب، قلب کی دھڑکن میں تناسب، نہ شوگر کا مسئلہ اور نہ ہی جوڑوں کا درد اور نہ ہی خوراک کے ہاضمے کی کوئی شکایت۔ میں اب بھی نہایت آسانی سے ناشتے میں دُنبے کے چھیلی چربی بھرے دو تین پائے یا دیسی گھی سے نچڑتے ہوئے حلوے کی لبریز پلیٹ یا ذائقے کو راغب کرنے والی کوئی ''چاکلیٹ سے موت'' نام کا نصف کیک بنا کسی معترض کے حلق سے اُتار سکتا تھا۔ ہضم کر سکتا تھا تو پھر مجھے سوائے بڑھاپے کے اور عارضہ کیا تھا۔ مجھے سوائے اک یک رنگی کے کوئی اور بیماری لاحق نہ تھی۔

یہ تو نہیں کہ یہ ایک یک طرفہ مکالمہ ہوتا تھا۔ پرندہ بھی اپنے دکھ سکھ میں مجھے شریک کرتا تھا۔ مجھ سے ہم کلام ہوتا تھا۔ اُس نے مجھے اپنی کوک کوک کی فریاد میں بتایا کہ بے شک اس برگد کی جڑیں اتنی گہری اور دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں کہ انہیں اکھیڑنے کے لیے پوری بستی اُدھیڑنی پڑتی تو اس لیے یہ برگد زمین بوس ہونے سے بچ گیا۔ انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اسے بہر صورت جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا ہے۔ جب بل ڈوزروں کے بلیڈ اس سے ماتھے لگائے زور لگاتے کند ہونے لگے تو برانڈرتھ روڈ کے ایک کاروباری نے جو چین سے لکڑی کاٹنے کے آرے خصوصی طور پر درآمد کرتا تھا اور لوگ اُسے اس کے نام سے نہیں آرا بھائی کے لاحقے سے جانتے تھے۔ اس نے اس برگد کا تیا پانچہ کرنے کے لیے ایک میکانکی آرا مہیا کر دیا اور تب اس آبادی کے ایک وسیع و عریض گھر میں مقیم تین دراز قامت خوش شکل اور مردانہ شباہت کی تصویریں بھائیوں میں سے ایک اُن میں سے جو سب سے چھوٹا تھا وہ بچپن میں جامن اُتارتا جامن کے پیڑ کی کچی شاخ ٹوٹنے سے زمین پر آ گرا اور اُسے کچھ گزند نہ پہنچی سوائے اس کے کہ کنپٹی پر چوٹ لگنے سے وہ ہمیشہ کے لیے نہ صرف اس دنیا سے بلکہ اپنے آپ سے بھی ماورا ہو گیا۔ اس سے بڑا بھائی مقامی مسجد کے مولانا کی شعلہ بیانی سے متاثر ہو کر حوروں کی حرص میں افغانستان میں جہاد کرنے کے لیے شہادت کی آرزو سے سرشار گیا۔ یہ آرزو پوری نہ ہوئی لیکن واپس آیا تو ہیروئن کو اپنے ہمراہ لے آیا۔ مجذوب ہو گیا اور تیسرا سب سے بڑا بھائی اُس کی مجذوبیت کا کچھ جواز نہ تھا۔ جنھز کا شاید جواز تھا اس نے دونوں بھائیوں کے عالم وارفتگی میں تنہا ہوش مند رہنے کو جان بوجھ کر اختیار نہ کیا اور جب آرا بھائی کے مہیا کردہ چین سے درآمد شدہ آرے کو اسے برگد کی شہ رگ پر رکھا گیا تو وہ حائل ہو گیا۔

''مت کاٹو...'' ''سینہ سپر ہو گیا'' ''مجھے کاٹو اگر کاٹنا ہے۔''

اب ایک مجذوب سے کون بحث کرتا۔ اُسے برگد کے ساتھ کون کاٹتا۔ یوں...... یہ برگد......

برگد میں بسیرا کرنے والا وہ پنچھی مجھ سے اور میں اس سے ہم کلام ہوتا رہتا۔ میں اُسے ان زمانوں کے قصے سناتا رہتا جب اس یک رنگ آرٹ گیلری میں آویزاں تصویروں کے شوخ اور بھڑکیلے رنگ فان خوخ کے برش کے لگائے ہوئے اتنے تیلے ہوتے تھے کہ میری پوروں میں منتقل ہوتے جاتے۔

وکٹوریہ پارک کی حبس زدہ شام میں لٹھے کی سفید شلواروں، آدھی آستین کی ٹی شرٹوں اور سفیدی سے پوچے ہوفلیٹ شوز میں بنی ٹھنی کرسچن لڑکیاں ایک سر سبز لان میں بیڈمنٹن کھیل رہی ہیں۔

ریکٹ گھماتی ہیں تو وہ میرے دل پہ جا لگتا ہے۔ شٹل کاک فضا میں بلند ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ان کی چنچل ہنسی بھی یوں بلند ہوتی ہے جیسے پیانو کی کیز پر کسی نے یک دم اپنی ہتھیلی رکھ دی ہو۔ ریکٹ جس جگہ دل پہ جا لگتا ہے اُس کے برابر میں جو تھوڑی سی جگہ خالی ہے وہاں ان کی ہنسی اُترتی ہے اور کھٹکنے لگتی ہے۔ وکٹوریہ پارک کی حبس زدہ شام میں۔

گڑھی شاہو لاہور کی کولونیل ثقافت کا جزیرہ...... اینگلو انڈین لڑکیاں جنہیں ہم اُلفت سے کرنٹیاں کہتے تھے لیڈیز سائیکل پر سوار کچھ اچھی بھلی صاف رنگت والیاں اور کچھ ذرا گندمی ہوتی اور کچھ کالیاں کالیاں پر اُن کی وہ ٹانگیں جو پیڈلوں پر بوجھ ڈالتی تھیں ان کی پنڈلیاں پھڑکتی کیسی متناسب اور جاندار ہوتی تھیں۔ سائیکلوں کی چرمی کاٹھیاں ان کی نوخیز پشتوں سے ڈھکی ڈھکی جاتی تھیں۔

وہاں ظاہر ہے کرنٹے بھی ہوتے تھے پر ہم ان کو کہاں دیکھتے تھے۔

گڑھی شاہو کے اگرچہ سادہ اور غریبانہ اینگلو انڈین گھرانوں کے دروازے سر شام اکثر کھلے ہوتے تھے اور ان کے نیم روشن اندرون میں سے والٹز اور کوئک سٹیپ کی دھنیں باہر فٹ پاتھ تک آتی وہاں بے وجہ چنچل قدمی کرنے والے ہم جیسوں کے قدم روکتی

تھیں۔ میں بھی رک جاتا تھا۔
ان گھرانوں کی ترکیب کے بیچ برٹ انسٹیٹیوٹ میں ہفتے کی شب اس ناچ گھر میں رقص کے شیدائی جوڑوں کے لیے اور ان میں صرف اینگلو ہی نہیں ہم جیسے باہر والے اندرون شہر کی گھٹن سے فرار ہو کر اس آزاد اور کھلے ماحول میں سانس لینے والے بھی ہوتے تھے، اُس کی کوٹھڑی تھی۔ مسٹر رابرٹ چوہدری پیانو بجایا کرتا تھا۔ تنگ دست رہتا کہ اُسے پیانو بجانے کے سوا اور کوئی کام نہ آتا تھا۔ زندگی کی تنگی ترشی کو وہ کبھی خاطر میں نہ لایا۔ ہمیشہ مسرت اور سرخوشی کی کیفیت میں ہمہ وقت چھیڑ چھاڑ کرنے والا وہ ایک خوش باش اینگلو انڈین ہوا کرتا تھا۔ اس کی کوٹھڑی میں اتنی گنجائش کہاں تھی کہ اُس کے قدیم برطانوی ساخت کے گرینڈ پیانو کے علاوہ ایک بستر بھی بچھ سکتا۔ وہاں بیٹھنے کے لیے سوائے اُس کے پیانو سٹول کے اور کچھ نہ تھا۔ گرمیوں کی شبوں میں وہ اپنی جھلنگا چار پائی جو دن بھر برابر کی دیوار کے ساتھ لگی دھوپ میں جھلستی رہتی اپنے مختصر صحن میں ڈالتے، بیئر کی ایک بوتل سے احتیاط سے گھونٹ بھرتا اُسے پوری شام پر محیط کر کے اکثر کچھ کھائے بغیر سو رہتا اور نیند میں مسکراتا رہتا۔ جب سرما کی خنک شبیں اُترتیں تو وہ گرینڈ پیانو کے نیچے ایک بوسیدہ کمبل اوڑھ کر سو رہتا اور نیند میں بھی مسکراتا رہتا۔

ہم جب بھی انور سید، انگریزی فلموں کا رسیا ریگل، پلازا اور اوڈین سینماؤں میں دکھائی جانے والی ہالی ووڈ کی فلموں کا حافظ، گلین فورڈ، جوزف کاٹن، جین پیٹرز اور 'پنک' والی کم ناوک کا شیدائی اور سلیم بیگ جو چوری چھپے گرم دوپہروں میں اہل خانہ بھیگی ہوئی خس کی ٹٹیوں میں گزرتی ہوا سے مدہوش ہوتے گھر کی بالائی منزل پر ممٹی کی اوڑھ میں ستار بجایا کرتا تھا تا آنکہ اس کے متشرع والد صاحب نے اُسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور ریڈیو بینڈ سروس کے استاد سوہنے خان سے کرائے پر حاصل کردہ ستار کے بچے یعنی تاریں اُدھیڑ دیں۔ تو ہم تینوں جب بھی مسٹر رابرٹ چوہدری کی کوٹھڑی کے سامنے ٹہلتے ہوئے گزرتے تو ہمارے قدم رک جاتے۔ اُس کے نیم روشن اندرون سے پیانو کی مدھم دُھنیں ہوا کے دوش پر پہلو بدلتی آتیں اور ہمارے جوان خون کو اُداس اور گہری رنجیدگی سے بھر دیتیں اور کبھی رابرٹ چوہدری مدھم سروں سے بغاوت کر کے پیانو کی کیز پر اپنی انگلیوں کی بوچھاڑ کرنے لگتا اور ہم اپنی اُداسی سے باہر آ کر دل ہی دل میں اُس دھن پر ناچنے لگتے۔

اگرچہ ان دنوں مجھے شراب سے کچھ شغف نہ تھا لیکن میرے ایک کرنٹے دوست نے بتایا کہ اگر تم رابرٹ چوہدری کے دل میں جگہ پانا چاہتے ہو تو اُس کے لیے بیئر کی ایک بوتل لے جاؤ۔ میں نے اپنے محدود پاکٹ خرچ کو اس ایک بوتل کے لیے صرف کر دیا۔

''ینگ مین'' اس نے انور سید اور سلیم بیگ کو مخاطب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ''خداوند یسوع تمہیں یقیناً اس نیکی کے عوض اپنی پسندیدہ بھیڑ بنالے گا۔''
کانسی کے گلاس میں انڈیلی ہوئی بیئر کی جھاگ کو اس نے پھونک مار کر پرے کیا اور مشروب کا ایک گھونٹ بھر کر تا دیر اپنے گالوں کے درمیان رہنے دیا تا کہ اُس کے کڑوے ذائقے سے حظ اُٹھاتے اپنے گھن لگے سوڑے گرم کر سکے اور پھر اُس گھونٹ کو حلق سے اُتارنے کے بعد اُس نے اپنی کھلی ہتھیلیاں پیانو کی۔ کیز کے اوپر معلق کر دیں'' کیا سنو گے؟''
''سر.....! آپ جو کچھ بھی سنائیں ہم سنیں گے۔''
''جو کچھ بھی؟''
''جی سر!''
''تو پھر میں تمہیں اپنی من پسند ایک ایسی پیانو دھن سناتا ہوں جو تم نے شاید کبھی نہ سنی ہو۔''
''جی سر.....''
صرف ایک گھونٹ بھرنے سے اور وہ بھی بیئر کا ایک گھونٹ بھرنے سے تو وہ مخمور نہ ہو سکتا تھا لیکن اس ایک گھونٹ نے کام کر دکھایا اور وہ ہماری موجودگی سے غافل ہو کر ایک اُداس خود کلامی کی گہرائی میں اُتر گیا۔
''میں نہ صرف ہفتے کی شب برٹ ناچ گھر اور وائی ایم سی اے میں ہی پیانو بجاتا ہوں بلکہ دل پر ایک بھاری پتھر رکھ کر سٹینڈرڈ ریستوران کی چھت پر ناچتی انجلا اور سلطانہ پشوری کے رقص کے ساتھ بھی سنگت کرتا ہوں۔ رزق کی مجبوری ہے۔ یوں بے خود ہو چکے حواس کھو چکے تماش بینوں کی جیبوں کو خالی کروانے کی چاہت میں مبتلا ان خواتین کے ڈانس کا ساتھ دینے کی خاطر پیانو کی بے حرمتی کرتا ہوں۔ شاید تمہیں پتہ ہو، نہیں تم تو ہمارے علاقے کے نہیں مسلم لوگ ہو تم کیسے جان سکتے ہو کہ البرٹ چوہدری پیانو ٹیون کرنے کا ماہر ہے تو کبھی کبھار خیال آتا ہے کہ اس آسمانی ساز کو بجانا چھوڑ دوں اور صرف ٹیوننگ سے ہی گزر اوقات کر لیا کروں۔ پھر خیال آتا ہے کہ میگی رنڈوا کیا کہے گی وہ میری پیانو نوازی پر ہی تو فدا ہو گئی تھی۔''

اس نے ایک اور گھونٹ بھرا۔ میری جانب دیکھ کر بولا ''میگ مین...... کیا سنو گے؟''

''آپ جو کچھ بھی سنا دیں سر......''

''تمہاری مہربانی کے عوض میں تمہیں اپنی فیورٹ دُھن سناؤں گا۔ یہ دُھن میگی کو بھی پاگل پن کی حد تک پسند تھی۔ سنو میگی'' البرٹ چوہدری نے ہم تینوں کے اب قدرے نروس ہو رہے بدنوں کے پار کہیں دیکھا ''سناؤں میگی'' اُس نے پھر پکارا......

ہمارے محدود علم کے مطابق بیئر ہلکے سے سرور والی شے تھی۔ کوئی نشہ آور مشروب نہ تھا لیکن یہ کرسٹان بابا اگر بہک رہا تھا تو کہیں جان بوجھ کر تو نہیں بہک رہا تھا۔ ہم میں سے کسی ایک کو قابو کرنے کے چکر میں تو نہیں تھا۔ ان دنوں والدین اپنے بچوں کو سختی سے ہدایت کیا کرتے تھے کہ خبردار کسی بندے کے ساتھ اکیلے اُس کے کمرے میں نہیں جانا۔ بے شک وہ تمہیں موتی چور لڈو کھلانے کا وعدہ کرے۔ اپنے کمرے میں پڑی ایک بڑی ساری پتنگ کا لالچ دے، نہیں جانا۔ تو ہم ڈر گئے۔ پھر ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر کہ ہم تینوں کے ذہن میں یہی خدشہ جنم لے رہا تھا اور پھر اس خیال سے ڈھارس بندھی کہ ہم تین ہیں اور اتنے بچے بھی نہیں ہیں۔ اس بوڑھے نے اگر دست درازی کی تو اس سے نپٹ لیں گے۔ پر البرٹ چوہدری اندرون شہر کے بوڑھے پہلوانوں ایسے بچہ شوق نہ رکھتا تھا۔ وہ ایک بے ضرر اور معصوم روح تھا۔ ہمیں پشیمانی ہوئی کہ آخر ہم نے اس کے بارے میں ایسی بیہودہ باتیں کیوں سوچیں۔ وہ بھی ہماری تشویش سے آگاہ ہو گیا۔ اگرچہ اُسے قطعی طور پر اندازہ نہ تھا کہ ہم کس نوعیت کی تشویش میں مبتلا تھے۔ ''میگی یہاں نہیں ہے...... اور نہ ہی میں خمار میں ہوں لیکن وہ جہاں کہیں بھی ہے یہ دُھن سنے گی اور...... مجھے یاد کر کے پچھتائے گی۔''

ہماری ہمت بندھ چکی تھی۔ میں تھا جس نے پوچھا ''چوہدری صاحب! یہ میگی کون تھی؟''

''اچھا سوال ہے'' وہ ایک بچے کی مانند قلقاری مارتا ہنس دیا ''میگی رندھاوا میری بیوی ہوا کرتی تھی۔ برٹ انسٹیٹیوٹ میں باقاعدگی سے ہفتے کی ہر شام رقص کے لیے آنے والے جھنگ کے ایک گھنی مونچھوں والے دراز قامت، ایچی سن کالج کے پڑھے ہوئے زمیندار کے طلسم میں گرفتار ہو کر مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور میں اسے موردِ الزام بھی نہیں ٹھہرا سکتا کہ اگر میں ایک عورت ہوتا اور میرا خاوند واجبی شکل کا ایک میوزیشن ہوتا تو میں بھی اُسے چھوڑ کر چلا جاتا یا چلی جاتی۔'' وہ پھر ہنسنے لگا ''مجھے نہیں معلوم کہ ان دنوں وہ کہاں ہے۔ پر کسی نے خبر کی تھی کہ وہ جھنگوی اسے اپنے گھر لے کر نہیں گیا تھا۔ اپنے ڈیرے پر رکھا تھا اور جی بھر جانے پر اُسے چُوڑی ہونے کا طعنہ دے کر نکال دیا تھا۔ حالانکہ وہ چُوڑی تو نہ تھی۔ رندھاوا جاٹوں کی نسل میں سے تھی۔ اُس کا باپ فضل داد رندھاوا ایک لیل پوری مشنری فادر کنہیا مسیح کے کردار سے متاثر ہو کر عیسائی ہو گیا تھا۔ جیسے بہت سے بھٹی راجپوت...... جاٹ برادری کے رنگل، باجوے اور چٹھے یسوع پر ایمان لے آئے تھے۔ اُس کی بھیڑوں میں شامل ہو گئے تھے تو میگی رندھاوا چُوڑی تو نہ تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری میگی کہاں اور کس حال میں ہے۔ ویسے اگر اب بھی وہ لوٹ آئے تو میں اسے کھلے دل سے قبول کر لوں کہ محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔''

البرٹ چوہدری کے دونوں ہاتھ یک بار اُٹھے، فضا میں کچھ دیر معلق رہے اور پھر اُس کی کبڑی ہو چکی انگلیاں اتنی نرماہٹ سے پیانو کیز پر اُتریں جیسے ایک کبوتر کے پنجے منڈیر پر اُترتے ہیں۔ ایک بلی دبے پاؤں اُترتی ہے۔ پیانو کی کیز پر البرٹ چوہدری کی انگلیاں تھیں۔ ایک کبوتر کے پنجے ایک بلی کے پاؤں آہستگی سے اُترے تھے۔ کسی دریا کے، کسی راوی یا ڈینوب کے پانی کروٹیں بدلتے تھے۔ تلاطم میں نہ آتے تھے ایک حدت بھرے بدن کی مانند سسکیاں اور وہ بھی دبی دبی بھرتے پہلو بدلتے تھے۔ کبھی یک دم اس کوٹھڑی میں پورا چاند اُتر آتا اور اس کے نیم اندھیارے کو روشن کر دیتا اور پل دو پل کے بعد وہ روشنی مدھم ہو کر ایک فریاد میں بدل جاتی۔ کوٹھڑی کے افلاس زدہ ماحول اور گھن لگے شہتیروں میں سرایت کرتی اس افلاس کو امیر کرتی، ان شہتیروں کو یوں نیا نویلا کرتی کہ ان میں سے ابھی ابھی ایک رندے سے چھیلے ہوئے برادے کی مہک آنے لگتی۔ اُس دُھن کی کوئی زبان تو نہ تھی پر مجھے یوں محسوس ہوا کہ ہے......

تم ہو...... تم ہو...... بس تم...... تم ہی تم...... اس چاندنی میں...... تم...... تم...... تم ہی ہو

نہ نہ...... تم تم...... ہاں ہاں...... تم...... تم ہو...... تم ہو...... تم ہو...... اس تاروں بھری رات میں...... تم ہو......

البرٹ چوہدری نے آخری بار اپنی انگلیاں آہستگی سے متحرک کیں...... تم ہو...... تم ہو...... اور پھر انہیں اٹھا کر بہت دیر فضا میں معلق رکھا۔ کوٹھڑی پھر سے نیم اندھیارے میں اُتر گئی۔ میں نے ازاں بعد حیات کے اس طویل سفر کے دوران...... وہی آنا۔

نیویارک اور میونخ کے موسیقی گھروں میں دنیا کے عظیم ترین موسیقاروں اور ان میں بمبئی کا پارسی یہودی منحون بھی شامل تھا۔ اُن کی انگلیوں سے جنم لیتا بیتھووِن کا ترتیب شدہ مون لائٹ سناٹا سنا تھا لیکن وہ سب گڑھی شاہو کے البرٹ چوہدری کے پیانو کانسرٹ کے سامنے ہیچ تھے...... ہیچ۔

ٹھیکیدار سلطان...... قبرستان میانی صاحب میں مولانا احمد علی، آغا حشر کاشمیری اور سعادت حسن منٹو کی قبروں کی قربت میں 1901ء سے دفن سلطان کی سرائے اور لاہور کا قلعہ نما ریلوے سٹیشن تعمیر کرنے والا ٹھیکیدار سلطان۔ اُس کے تعمیر کردہ برصغیر کے سب بڑے شاندار ریلوے سٹیشن کے اندر جو بھی ریل گاڑی رُکتی یا چھوٹتی اس کے آہنی پہیوں کی دھمک گڑھی شاہو کے اُس فٹ پاتھ پہ جہاں ہم تینوں اپنے اندرون شہر کی گھٹن سے فرار ہو کر آزادی، موسیقی اور نسوانی قربت کی ترسے ہوئے سرِشام آنکلتے تھے۔ اُس ایک رکی، چھوٹتی گاڑی کی دھمک اپنے پاؤں میں محسوس کیا کرتے تھے۔

پاکستان ریلویز کے تقریباً سبھی گارڈ اور انجن ڈرائیور ابھی تک کولونیکل ماضی کے تسلسل میں اینگلو انڈین چلے آتے تھے۔ معدودے چند انجن ڈرائیور قدرے مخدوش قسم کے گورے بھی تھے۔ انہوں نے تقسیم کے بعد انگلستان منتقل ہو جانے کی بجائے لاہور میں ہی ٹھہر جانے کو ترجیح دی تھی کہ وہ بمبئی پونا، ڈیرہ دون یا لاہور کے پروردہ تھے۔ وہ جب بھی چھٹیاں منانے کے لیے اپنے آبائی وطن لوٹتے تو وہاں انہیں مکمل طور پر قبول نہ کیا جاتا کہ وہ ایک ہندوستانی سانچے میں ڈھل کر خالص انگریز نہ رہے تھے۔ روسٹ بیف اور ایپل پائی پر مصالحے دار کڑی گوشت، دال بھات اور جلیبیوں کو ترجیح دیتے تھے اور یہاں لاہور میں وہ ابھی تک ایسے گورا صاحب تھے کہ نیٹو لوگ انہیں سامنے سے آتے دیکھ کر جھکتے ہوئے کورنش بجا لاتے راستہ چھوڑ دیتے تھے۔

گڑھی شاہو میں ریلوے کے اینگلو انڈین ملازمین کے گھر تھے۔ برابر میں ریلوے کالونی کے برطانوی طرز کے قدیم گھروں میں سے اول درجے کے گھروں میں درجہ دوم کے گورے اور درجہ دوم میں سینئر ریلوے ملازمین رہائش رکھتے تھے۔ البتہ میو گارڈنز کے ایکڑوں میں پھیلے ہوئے بنگلوں میں صرف درجہ اول کے گورے لوگ رہائش رکھتے تھے۔ انجن ڈرائور اور معدودے چند انجینئر۔ تنخواہوں کا سکیل بھی رنگت پر منحصر تھا۔ گورے گوروں کو...... اینگلو گوروں کی نسبت تین گنا زیادہ تنخواہ ملتی تھی۔

ایک ایسے ہی پاکستان میں ٹھہر چکے بوڑھے گورے انجن ڈرائیور کی ایک مقامی جنٹلمن سے عشق کی شادی کے شاخسانے سے پیدا ہونے والی بیٹی الزبتھ سینڈ ہرسٹ تھی۔ وہ پورے گڑھی شاہو کی سویٹ ہارٹ تھی۔ سائیکلنگ کرتی جب وہ ہم تینوں مسکیٹیرز کے قریب سے گزرتی تو ہمیشہ ہماری جانب کہ ہم مریدوں کی مانند اُس کے لانگ سکرٹ میں سے کبھی کبھار سفید سفید ٹانگوں کی جھلک کے تمنائی ہوتے تو وہ ہمیشہ ہماری جانب ایک ہوائی بوسہ اُچھال دیتی اور ہم پتھر ہو جاتے۔ ویسے گڑھی شاہو کے بیشتر کرنٹے بھی لٹوؤں کی مانند اُس کی سائیکل کے گرد گھومتے رہتے تھے۔ پر وہ کسی کو بھی اپنی نظر کرم سے نہ نوازتی تھی۔ اُس کے انجن ڈرائیور باپ نے باقاعدہ منصوبہ بندی کر رکھی تھی کہ وہ اسے بیک ہوم لے جائے گا اور اپنے کسی دور پار کے عزیز سے بیاہ دے گا۔ ان دنوں لاہور میں الزبتھ ٹیلر کی فلم ''کیٹ آن اے ہاٹ ٹن روف'' کی بڑی دھوم تھی تو اُسے نہ صرف لِز آف گڑھی شاہو کا خطاب دیا گیا بلکہ دل جلے کرنٹے اسے دیکھ کر کیٹ آن اے ہاٹ ٹن روف کے آوازے بھی کستے تھے۔

آرٹ گیلری میں آویزاں گڑھی شاہو کی تصویر میں ایسے ایسے شوخ اور زندگی کی چلبلاہٹ سے نچڑتے رنگ ہوا کرتے تھے۔ میں منیر شیخ...... ایسا کشمیری نژاد کہ سردیوں میں جب میں ایک اونی کنٹوپ اوڑھتا ہوں تو ایک ادیب دوست کے بقول فوری طور پر ایک ''ہاتو'' میں بدل جاتا ہوں۔ جو کوئلوں سے سلگتی کانگڑی اپنے کمبل میں پوشیدہ کیے شب دیگ کے خواب دیکھتا ہے۔ میں کشمیری ہونے کے ناتے سے خوش رنگ تو تھا ہی پر خوش شکل بھی خاصا ہوا کرتا تھا۔ ایسا تو نہ ہوتا تھا جیسا اب ہوں۔ پتھریلے بنچ پر ڈھیر پارک میں سیر کرنے والوں کو بجھتی آنکھوں سے تکتا۔ نیم اپاہج اور لاچار...... موت کا منتظر!

میں منیر شیخ ہمیشہ سے ایک معتدل نوعیت کا مذہبی شخص رہا ہوں۔ نماز کم ہی قضا کرتا ہوں اور باقاعدگی سے فجر کی نماز کے بعد قرآن پاک کی پورے رجوع سے تلاوت کرتا ہوں جو مجھے ایک عجیب روحانی آسودگی سے سرشار کرتی ہے۔ البتہ میں داڑھی بردار نہیں ہوں۔ روزانہ نہایت اہتمام سے اولڈ سپائس کے صابن کی جھاگ گالوں پر پوچ کر ایک وکٹورین طرز کے اُسترے سے شیو بناتا ہوں۔ پارک میں کبھی کبھار کچھ گھنی داڑھیوں والے عوام الناس کو راہ

راست پر لانے کے مقدس مشن کی تکمیل کے لیے آ نکلتے ہیں۔ وہ جوگنگ کرتے ہوئے نیکر میں ملبوس جوانوں اور بوڑھوں کو سرزنش کرتے ہیں اور کبھی کبھار کسی نوجوان لڑکی کو بیٹی کہہ کر روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بیٹی آپ اتنی گھنی لپ سٹک نہ لگایا کرو یہ فعل معیوب بھی ہے اور لپ سٹک لگانے سے ہونٹوں کے مسام بھی بند ہو جاتے ہیں۔ شکر ہے یہ حضرات کبھی کبھار ہی نازل ہوتے ہیں۔ ایک بار ان میں سے دو باریش نوجوان میرے پاس آئے اور نہایت مؤدب ہو کر کہنے لگے "باباجی روز حشر کیا منہ دکھاؤ گے۔ آپ جانتے ہو کہ جب آپ صبح سویرے شیو کرتے ہو تو ہر بال جو آپ کاٹتے ہو وہ قیامت کے دن تمہارے خلاف گواہی دے گا کہ ہم تو چاہتے تھے پر اس نے ہمیں سنت پر عمل کرنے سے روکا تھا۔ میں نے ایک بار داڑھی رکھ لی تھی پر مجھے کھجلی بہت ہوتی تھی اور میری اہلیہ جو جوڑوں کے درد کی اذیت میں مبتلا تقریباً سارا دن مصلّے پر بیٹھی رہتی ہے اس نے کہا تھا...... منو جی! تم میرے منو نہیں لگتے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی ہو گی کہ اس عمر میں یہ چونچلے...... آپ بے شک یقین نہ کریں لیکن ساٹھ برس پیشتر جس ہنی مون کا آغاز ہوا تھا اس کی حدت ابھی تک قائم ہے۔ اگرچہ بدن سرد ہو چکے ہیں۔ ہم دونوں ابھی تک اپنے پہلے عشق میں مبتلا ٹین ایجرز کی مانند ایک دوسرے کی چاہت میں ڈوبے، ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ جیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اگلی صبح پھر سے اپنے رخساروں کو صاف کر دیا۔ میں واش روم سے واپس آیا تو وہ مصلّے پر بیٹھی سلام پھیر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ شرمانے لگی۔

میں منیر شیخ...... ابھی اس پتھریلے بنچ سے اٹھ کر...... اپنے پاؤں گھسیٹتا ہونے ہولے برگد میں پوشیدہ اپنے پرندے کے پاس جاؤں گا اس سے باتیں کروں گا۔

مال روڈ پر کارپوریشن کی گاڑیاں دوپہر ڈھلتے ہی اس کے دونوں جانب اس کے پہلو میں چلتے نہر تک جاتے باغیچوں اور گرم کولتار پر پانی کا چھڑکاؤ کیا کرتیں۔ ہم اندرون شہر کے باسی اسے ٹھنڈی سڑک ہی کہا کرتے تھے۔ وہاں باباڈنگا سنگھ بلڈنگ جس کے چاروں گھڑیال کسی چار مکھی ہندو دیوی کی مانند اس کے گنبد پر براجمان باقاعدگی سے وقت گزرنے کی منادی کرتے تھے۔ ایک چہرہ ہائی کورٹ اور جی پی او کی عمارتوں کو تکتا ماتھے کا رخ مال روڈ سے پرے سینٹ انتھونی چرچ کے آسمان میں نقب لگاتے برج میناروں کی طرف...... دوسری جانب یہ چومکھی گھڑیال چیئرنگ کراس اور گورنر ہاؤس تک کو نظر میں رکھتے تھے اور اس کا عقبی چہرہ بیڈن روڈ سے پرے لکشمی چوک سے بھی دکھائی دیا کرتا تھا۔ ڈنگا سنگھ بلڈنگ کے "شیزان ریستوران" میں چائے کا ایک کپ اور ایک گرم پیٹی کھانے کے لیے ہم مہینہ بھر پیسے جمع کرتے رہتے۔ ڈنگا سنگھ بلڈنگ کے برابر میں چینی شومیکر ہاسن کی دکان تھی اس کے قریب "ایم یاسین خان" کا جنرل سٹور اور بیکری تھی۔ دکان کے پچھواڑے میں ان کا تنور اور باورچی خانہ تھا۔ چنانچہ ان کے کریم رول، پیسٹریاں اور کولونیل مزاج اور ذائقے کے کیک تازہ تازہ شیشوں کے شوکیس میں ابھی ترتیب دیے جاتے اور ابھی فروخت ہو جاتے۔ ایم یاسین خان سے آگے ان دنوں جو ہوٹل انڈس ہے ان دنوں الفنسٹن ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس کے برابر میں ایک کچی سڑک اس خوابناک وادی میں اترتی تھی جس کا نام وکٹوریہ پارک تھا۔

جغرافیہ واضح کرنے کی خاطر مقام کی درست نشاندہی کرنے کے لیے یہ عرض کر دوں کہ اس کچی سڑک کے دوسری جانب چیئرنگ کراس سے پہلے غلام رسول تارڑ بلڈنگ کی خوش نما بالکونیاں اور زرد گنبد تھے اس کے اندرون میں کوڈک اور گنیڈر سپورٹس کے شو روم تھے۔ بہت بعد میں اسی عمارت میں "فیروز سنز" کا کتابوں کا شوروم وجود میں آیا۔

تو الفنسٹن ہوٹل اور غلام رسول تارڑ بلڈنگ کے درمیان میں سے ایک راستہ کسی حد تک ڈھلوان وکٹوریہ پارک میں اترتا تھا۔ ہمارے لیے ان زمانوں میں جب ہمارے بدن کچے بیر ہوتے تھے معصومیت کی بے خبری کی دھند میں ڈوبے راتوں کو گیلے ہوتے تھے۔ وہ راستہ گویا پریوں کی ایک سلطنت میں اترتا تھا۔ بے شک وہ پریاں قدرے سانولی سلونی اور کبھی کبھار آ بنوسی رنگت کی ہوتی تھیں لیکن ان زمانوں میں جب ہمارے ہاں کی لڑکیاں مکمل طور پر ڈھکی ہوتی تھیں اور اگر چلتے ہوئے ہمیں شلوار کے ذرا سے اوپر اٹھنے پر ان کا ٹخنہ نظر آتا تھا تو ہم پوری لڑکی پر عاشق ہو جایا کرتے تھے تو ان وقتوں میں پوری کی پوری لڑکیاں اور باقاعدہ لڑکیاں بے حجاب، بے برقعہ یوں ظاہر ہوتی کہ ان کے بالوں میں پیوستہ رنگ رنگ کے کلپ تو ہمارے بدنوں میں کھب جاتے تھے اور وہ بیڈمنٹن کھیلتی ہوئی ذرہ بھر خیال نہ کرتی تھیں کہ ریکٹ پر اترتی شٹل کاک کو نشانہ بنانے کے لیے وہ اگر ذرا سا

کودتی ہیں تو ان کی بدنی بناوٹ اُتھل پتھل ہو جاتی ہے۔ راوی کی کھنگا مچھلی کی مانند اُن کی نصف آستینوں کی ٹی شرٹوں میں جو متحرک تڑپ جنم لیتی ہے۔ وہ تو ہمیں بھی تڑپاتی ہے، مار ڈالتی ہے۔ البتہ یہاں رہائش پذیر اینگلو لڑکیاں گڑھی شاہو والیوں کی نسبت قدرے تنک چڑھی تھیں۔ ادھر کے عیسائی خاندانوں کے افراد زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق تھے، ہوٹل منیجر، اکاؤنٹنٹ، سٹینو ٹائپسٹ، صحافی اور مشنری سکولوں کے ٹیچر جب کہ گڑھی شاہو کے تقریباً سبھی مکین نارتھ ویسٹرن ریلویز کے اہم کل پرزے تھے۔ اُن میں سے کچھ البرٹ چودھری ایسے موسیقار بھی تھے اور میڈم او برائن ایسی دیسی خون میں آئرش ملاوٹ والی پروقار خاتون بھی جنہوں نے اپنے گھر میں ایک ڈانسنگ سکول کھول رکھا تھا جہاں سے فارغ التحصیل طلباء برٹ انسٹیوٹ کے فلور پر والٹز، کوئک سٹیپ اور رمبا سمبا وغیرہ ناچتے پہچانے جاتے تھے کہ وہ میڈم او برائن کے تربیت یافتہ ہیں۔ گڑھی شاہو والے ایک ہی محکمے سے منسلک ہونے کی وجہ سے ایک بڑا خاندان تھے اور ان کا مزاج عوامی اور فراخ دل تھا۔ جب کہ وکٹوریہ پارک والے اپنے آپ کو ان ریلوائی لوگوں سے برتر سمجھتے تھے۔ یہاں ہماری دال نہ گلتی تھی۔ بیڈمنٹن کھیلنے والی گوری کالی اپسراؤں کے والدین کورٹ کے باہر بانس کی کرسیوں پر براجمان ہم جیسے آس پاس منڈلاتے مُسلوں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ اس وکٹوریہ پارک کی ایک چیلی کولونیل کوٹھی میں کوئی ماہیا صاحب اپنی پست قد اگرچہ خوبرو بیٹی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ وہ ابھی فلمی دنیا میں چھوٹے موٹے کردار ادا کرتی تھی۔ نامورنہ ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود فارغ نہیں رہتی تھی۔ مجھے ان دنوں مشہور عالم لوگوں، ادیبوں، کھلاڑیوں اور اداکاروں وغیرہ کے آٹوگراف حاصل کرنے کا خبط ہو گیا۔ چنانچہ میں ایک شام اپنی آٹوگراف بک سے لیس ہو کر چیلی کوٹھی تک پہنچ گیا۔ مجھے ایک خوشگوار بھی اور تشویش ناک حیرت نے پریشان سا کر دیا کہ وہاں میری بہت آؤ بھگت ہوئی۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ میں خانم سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے باقاعدہ ایک بوسیدگی کی مہک میں گم ڈرائنگ روم کے اکلوتے صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ جس کے سپرنگ جانے کب کے بیٹھ چکے تھے۔ ماہیا صاحب یہ ان کا فرضی نام ہے۔ ایک مختصر قد کے سیاہ اچکن میں ملبوس دیہاتی شباہت کے شخص تھے مجھے نہایت گرم جوشی سے ملے اور کہنے لگے بے بی بیڈمنٹن کھیل رہی ہے ابھی آتی ہی ہوگی۔ آپ لیمونیڈ پیجیے۔

بے بی جب ظہور پذیر ہوئی تو وہ بھی اپنے ابا کی مانند 'بوٹے سے قد کی تھی۔ ایک ایسا 'بونا جو مناسب مقامات پر تومند تو تھا پر اپنی مختصر قامتی پر قناعت کر گیا تھا۔ میرا تو دل، جگر، گردے، پھیپھڑے اور دیگر نظام بدن رُک گیا۔ بے شک بے بی مجھ سے عمر میں چار چھ برس بڑی تھی پر میری نیم بلوغت کے مکھن پر اس کا معصوم حُسن اس کی مینڈھیاں اور ان میں بندھے ربن، مسکراہٹ بھی بے حد گوری، چنگاریوں کی مانند گرے اور میرے مکھن کو پگھلا کر رکھ دیا۔ بلوغت کا مکھن تو ذرا سی آنچ سے بھی پگھل جاتا ہے اور یہاں تو ایک الاؤ تھا۔

''جی......'' بے بی نے مسکراہٹ کی ایک بجلی سی مجھ پر گرائی ''ہم آپ کی کیا خدمت کریں؟''

میں نے اپنے معطل شدہ نظام بدن اور حواس کو مجتمع کر کے جیب میں سے آٹوگراف بک برآمد کی اور نہایت لجاجت سے کہا ''آٹوگراف پلیز......'' ماہیا کو ایک جھٹکا سا لگا اور ناگواری اُن کے چہرے پر بچھ گئی۔

بے بی جو ایک لمحہ پیشتر اٹھلاتی نخراتی، اپنی مختصر قامت سے حشر برپا کرتی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی، اُس کے چہرے کے علاوہ مینڈھیوں میں بندھے شوخ رنگوں کے ربن بھی مرجھا گئے۔ بہت مدت بعد جب میری نیم بلوغت، مکمل بلوغت کی منزل کو پہنچی تب مجھ پر کھلا تھا کہ ان دونوں کی مایوسی کا سبب کیا تھا۔ بہرطور بے بی نے اپنے آپ پر ضبط کر کے کہ اُس کا بناؤ سنگھار اکارت گیا تھا نہایت اٹک اٹک کر جیسے ایک بچہ تختی لکھتا ہے انگریزی میں اپنے نام کے ہجے میری آٹوگراف بک پر گھسیٹ دیے کہ شاید یہ اُس کی زندگی کا پہلا آٹوگراف تھا۔

ان کے سوا گڑھی شاہو اور وکٹوریہ پارک کے علاوہ لاہور میں ایک اور جادوگر بھی ہوا کرتا تھا۔

مال روڈ کی جانب چہرہ کیے ہیڈن روڈ اور ہال روڈ کے سنگم پر اس عہد میں جدید ترین فلیٹوں پر مشتمل جن کے درمیان میں ایک سبزہ زار نہایت خفیہ قسم کا ایک قدیم برگد اُس سبزہ زار کے نصف حصے پر چھاؤں کرتے، لکشمی مینشن نام کا تھا۔ یہاں کے عیسائی، پارسی، ہندو اور مسلمان مکین وکٹوریہ پارک والوں سے بھی تنک چڑھانے میں دو قدم آگے تھے۔ لکشمی مینشن کے جدید رعب میں داخل ہونے کا مرکزی راستہ ہال روڈ کی جانب تھا۔ اگرچہ ہیڈن روڈ پر بھی ایک ذیلی

راستہ کھلتا تھا۔ ہم تینوں سکینڈ بے دھڑک گڑھی شاہو میں سرِ شام سیر گشت کرتے۔ وکٹوریہ پارک میں داخل ہوتے ہوئے ذرا احتیاط پسند ہوتے لیکن لکشمی مینشن میں قدم رکھتے ہوئے بے حد جھجکتے، یہ ایک ذاتی اور کسی حد تک مقفل کمیونٹی تھی اور کوئی بھی اجنبی اگر اس میں داخل ہوتا تھا تو سب مکینوں کی نظروں میں آ جاتا تھا۔ اس فلیٹوں کے مجموعے میں نہ صرف نہایت صاحب قسم کے کرنٹے رہائش پذیر تھے، کچھ نہایت کالے اپنی بے سبب پستی سے تعلیم کے زور پر معزز ہو چکے عیسائی خاندانوں کے کم از کم تین ہندو خاندانوں اور وہاں مسلمان بھی تھے اور یہ سب آپس میں رنگے جاتے تھے لیکن لکشمی مینشن کی تصویر کائنات میں رنگ اُس کے پارسی بھرتے تھے۔ اصل رونق اور حسن اُن کے دم قدم سے تھا۔ بے ضرر، معصوم، صرف آپس میں مسلسل شادیوں کے نتیجے میں ذرا کھلے اور ڈھیلے سے لیکن پارسی لڑکیاں اس نسلی تواتر کی خامیوں کے باوجود جب اپنے فلیٹوں کی بالکونیوں کے ساتھ لگ کر جھانکتیں تو اُن کی خوش نمائی اور بھولپن ایک زرد چاند کی مانند اُبھر کر سارے میں ایک زرد چاندنی بچھا دیتا۔

تب ہم آگاہ نہ تھے۔ ایک مدت بعد کھلا کہ لکشمی مینشن کے سبزہ زار میں چھاؤں کرتے پرانے برگد کے عین سامنے سعادت حسن منٹو کا بسیرا تھا۔ موسم بہار کے آغاز میں جب لارنس گارڈن کے گل بوٹے لاہور کے شدید موسم سرما کے اختتام پر پھول پتے اور کلیاں ظاہر کرنے لگتے تو ان زمانوں میں ان کا پارسیوں کا جشن نوروز کھل کھلاتا۔

میدانوں سے ذرا کنارے پر کہیں کوہ سلمان کی گھاٹیوں میں، فورٹ منڈیمان کے آس پاس کے سرد ویرانوں میں مختصر بادام کے پستہ قد درختوں کی سوکھ چکی ٹہنیوں میں سے جب پہلے سفید شگوفے کے آثار ایک حیرت کدے کا منظر لیے نظر میں اُترتے ہیں تو یہ نو روز کے آغاز کا سفید شگوفہ پیغام ہوتا ہے۔ جشن نوروز کا آغاز ہوتا ہے۔ میں تو صرف عید، بقر عید یا کرسمس کے تہوار سے واقف تھا۔ کرسمس سے واقفیت بھی گڑھی شاہو کی نسبت سے ہوئی جس کے ریلوے کوارٹر اور معمولی درجے کے مکان اور رابرٹ چوہدری کی کوٹھڑی کرسمس لائٹس سے دمک اُٹھتے۔ اینگلو انڈین شوخ بھڑکیلے رنگوں میں سج بن کر برٹ انسٹیٹیوٹ میں رقص کرنے کے لیے جاتیں اور جن کے بوائے فرینڈ قدرے حیثیت والے ہوتے۔ وہ جم خانہ کلب کے کسی ممبر کی منت سماجت کر کے اُس کے کولونیل بال روم تک رسائی حاصل کر لیتیں۔ رابرٹ چوہدری کرسمس کی شب بیئر کی جھاگ ترک کر کے اپنے آپ کو سکاچ وہسکی کے خمار آلود سنگھاسن پر بٹھا کر بنگ کراسبے کا آئی ایم ڈریمنگ آف اے وہائٹ کرسمس پیانو پر مسلسل بجاتا رہتا۔ حالانکہ اس نے سوائے پٹ سن کی بوریوں میں لپٹی بچی برف کے سوا اور کوئی برف کبھی نہ دیکھی تھی اور پھر بھی وہ ایک برف آلود سفید کرسمس کے خواب دیکھتا۔ ہم خاص طور پر سینٹ انتھونی چرچ کی کرسمس سروس ضرور اٹینڈ کرتے کہ وہاں کرنٹیوں کی بڑی ورائٹی ہوا کرتی تھی...... لیکن یہ نو روز...... میں اس سے لکشمی مینشن کے سترہ نمبر فلیٹ کے عین سامنے جو پارسی گھرانہ مقیم تھا اُس کی سیڑھیوں پر بجے رنگوں سے نقش گل بوٹوں سے آگاہ ہوا۔ ایک شب فلیٹ کے دروازے تک جاتی تین سیڑھیاں سیمنٹ کی ایک صاف سلیٹ ہوتیں اور اگلے روز ان پر قدیم نمونوں کے پھول پتے نقش ہوتے اور وہ روز پارسی لوگوں کا نو روز ہوتا۔ اس گھرانے میں تین نہایت نازک ملوک، سفید موم کی رنگت والے چہروں کی لڑکیاں رہتی تھیں اور وہ تینوں لنگڑا کر چلتی تھیں۔ نسل در نسل آپس کی شادیوں کے شاخسانے میں انہیں یہ معذوری کا دردناک تحفہ ملا تھا۔ ان کا شاید ایک ہی بھائی تھا بیرٹ نام کا جو بیڈن روڈ پر ایک بیکری چلاتا تھا جس کے اندر تازہ ڈبل روٹی اور پیسٹریوں کی کریم کی ملی جلی مہک ہوتی۔ لکشمی مینشن کے ایک باسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تینوں لنگڑیاں نو روز کی سویر، سورج طلوع ہونے سے پیشتر چھوٹے چھوٹے ٹین کے ڈبوں میں لال پیلے، ہرے نیلے رنگ کے سفوف بھر کر اور ان ڈبوں کے پیندوں میں سوراخ ہوتے تھے۔ سیڑھیوں پر گل بوٹے بناتی تھیں۔ سویر کی سفیدی اترنے سے پہلے کہ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتی تھیں۔ گرتی پڑتی، بمشکل سنبھلتی وہ جشن نو روز کو خوش آمدید کہنے کے لیے یہ پھول پتے عقیدت اور انہماک سے سیڑھیوں پر تخلیق کرتی تھیں اور وہ اپنی معذوری سے مجبور تا کہ کوئی انہیں لڑھکتے اور لنگڑاتے نہ دیکھے وہ سویر کی سفیدی اترنے سے پیشتر اپنی سیڑھیوں کو رنگین نو بہار سے آشنا کر کے روپوش ہو جاتی تھیں۔ تب میں نے اس نازک ملوک موم کی اپاہج گڑیا لڑکی کو دیکھا۔

میں اب تک اپنی نوخیزی کے ہیجان میں سلگتا، گڑھی شاہو کی اینگلو لڑکیوں کو دیکھ دیکھ بھڑکتا تھا۔ وکٹوریا پارک میں بیڈمنٹن کھیلتی گوری کالی کرنٹیوں کی شٹل کاک کے تعاقب میں اچھل کود میرے اندر کھلبلی مچا دیتی تھی لیکن یہ سب نوخیزی کے اشتعال کے عارضی

اُبال اور گرم خون کی منہ زوری کے کرشمے تھے۔

جب میں نے اس نازک ملوک لڑکی کو دیکھا اور تب مجھ پر کھلا کہ کیسے ایک شکل یک دم سینے میں چھید کر کے تمہارے بدن میں نقب لگا کر ہر رگ ہر شریان میں یوں گردش کرنے لگتی ہے کہ وہ چاہے تو روانی میں رہے اور تمہیں زندہ رکھے اور چاہے تو دل کو سیراب کرتی کسی شریان میں اٹک کر تمہیں مار ڈالے۔ وہ زندگی اور موت پر قادر ہو جاتی ہے۔

میں تو اگلے برس محض تجسس کی خاطر نوروز کی اس سویر میں لکشمی مینشن چلا آیا تھا جب ابھی سورج کی سفیدی نے اُس کے در و دیوار واضح نہ کیے تھے۔ صرف یہ مشاہدہ کرنے کے لیے کہ سیڑھیوں پر وہ گل بوٹے کیسے نقش کیے جاتے ہیں۔ میں سترہ نمبر فلیٹ کے اُس دروازے کی اوٹ میں ہو گیا جس پر متعدد بار پینٹ کیا ہوا رنگ پپڑیوں کی صورت میں اکھڑ رہا تھا۔ میرا انتظار طویل نہ ہوا۔ اس نیم اندھیارے میں سے ایک پھول دار فراک پہنے جو اس کے ٹخنوں تک آتا تھا مختلف رنگوں کے ڈبے سنبھالتی فلیٹ کی سیڑھیوں پر وہ اُتری۔ اپنے آپ کو سنبھالتی اگرچہ ذرا ڈولتی، ظاہر ہے سامنے والے فلیٹ کی اوٹ میں جھانکنے والی میری آنکھوں سے بے خبر وہ سیڑھیوں پر پھول پتے ایسی بناوٹ اور شکل کے جو میرے لیے اجنبی تھے جھک کر بنانے لگی۔

میں ان رنگ رنگ کی شکلوں اور بناوٹوں کی تشکیل سے آگاہ نہ تھا۔ پر آج جب کہ میں اسی کے پیٹے میں ہوں برگد میں پوشیدہ نادیدہ دوست پرندے کے ساتھ ہم کلامی کے بعد اس پتھریلے بنچ پر لاچار بیٹھا گھر واپس لے جانے کے لیے اپنے بیٹے کا انتظار کر رہا ہوں تو آج تو میں آگاہ ہو چکا ہوں کہ وہ نازک ملوک لنگڑی لڑکی لاہور شہر کے لکشمی مینشن کی سیڑھیوں پر جو پھول بوٹے نوروز کی آمد پر نقش کرتی تھی وہی نقش و نگار ہیں جو اس کے آباؤ اجداد ہزاروں برسوں سے اپنے آبائی وطن ایران میں نوروز کی آمد پر اپنے گھروں کے باہر اسے خوش آمدید کہنے کی خاطر تخلیق کیا کرتے تھے اور جب عرب کے بدوؤں نے ان کے آتش کدوں کی آگ بجھا دی، انہیں ان کے وطن سے بے دخل کر دیا تو وہ کسی ایک آتش کدے کے ایک شعلے کو سینوں میں روپوش کر کے ہندوستان کے ساحلوں کی جانب کوچ کر گئے۔ زرتشت کے یہ پیروکار نہایت دھیمے اور صوفی مزاج کے امن پر یقین رکھنے والے لوگ تھے۔ بھلائی پر اتنا یقین رکھتے تھے کہ اپنے مردے خاموشی کے میناروں پر کھلی فضا میں رکھ دیتے تھے تاکہ وہ مرنے کے بعد بھی کیڑوں مکوڑوں کی بجائے پرندوں کے پیٹ بھر سکیں۔

وہ نازک ملوک لڑکی جس کا چہرہ نوجوانی کے نور سے دمکتا نہ تھا موم کا بنا ہوا بے جان سا لگتا تھا جب نوروز کی گل بہار علامتیں اپنے گھر کی سیڑھیوں پر نقش کر کے اُٹھی تو لڑکھڑا گئی۔

بس یہی وہ لمحہ تھا جب میرے بدن میں اس کی شکل نے چھید کر ڈالا۔ جب میں یقیناً زندگی میں پہلی مرتبہ اور گمان ہے کہ آخری مرتبہ محبت میں مبتلا ہوا۔

جب وہ اُٹھتے ہوئے لڑکھڑا گئی تو تو میرا جی چاہا کہ میں اپنی پوشیدگی میں سے ظاہر ہو کر آگے بڑھ کر اسے تھام لوں لیکن ہمت نہ ہوئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے ہی تو اُسے ایک مسلمان کی صورت اس کے پارس سے بے دخل کیا تھا تو میں کس منہ سے اُسے اب سہارا دوں۔

ہم تین مسکیٹئرز سلیم بیگ، انور سید اور میں تقریباً ہر شب گڑھی شاہو یا وکٹوریہ پارک میں مٹر گشت کرتے گزرتے تھے۔ وہ دونوں سلیم اور انور مجھ سے بدظن ہونے لگے کہ میں لکشمی مینشن میں جانے کی ضد کرتا۔ مجھے کچھ اور بھائی ہی نہ دیتا تھا۔ میری آنکھوں میں اس کا موم چہرہ پگھلتا رہتا تھا۔ عشق آتش روشن رہتی تھی۔ مجھے آج تک قلق ہے کہ میں نے آخر ذرا ہمت کر کے اُس کے سامنے اپنے دل کو کھول کیوں نہ دیا۔ اظہار کیوں نہ کر دیا۔ وہ تو بے خبر ہی رہی۔

مجھے بہت سے عارضے لاحق ہو چکے ہیں۔ بدن میں جو کچھ بھی حیات کے تسلسل کو رواں رکھتا ہے بڑی آنت، مثانے اور پراسٹریٹ کے متعدد آپریشن ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ میں بائی پاس سرجری کے مرگ ناک مراحل میں سے بھی گزر چکا ہوں اور جو لوگ اگرچہ ان دنوں مناسب حد تک محفوظ اس آپریشن کی ہولناکی اور دہشت سے گزر چکے ہیں پسلیوں کے پنجرے کو ایک آری سے کاٹ دینے اور پھر کچھ عرصہ کے لیے آپ کی دھڑکن کو ایک مشین کے سپرد کر دینے، بدن کو ایک عارضی فنا کے حوالے کر کے، دل کی ناکارہ رگوں کو تبدیل کرنے کے عمل سے واقف ہیں۔ جانتے ہیں کہ آپریشن سے قبل آپ کے بدن کے سارے بال مونڈھ کر آپ کو ایک ویران اور نیم تاریک کمرے میں ایک تختے پر لٹا دیا جاتا ہے۔ عزیز و اقارب بہت دور کسی اور خلا میں سوگوار کسی بھی خبر کے لیے اپنے ماؤف زدہ ذہن کو تیار کرتے دعائیں مانگ رہے ہیں اور آپ بے بس اور مکمل طور پر تنہا ایک نیم

برہنہ حالت میں تختے پر لیٹے نہیں جانتے کہ ابھی بے ہوش کیے جانے کے بعد آپ کی آنکھ اگر کھلی تو کہاں کھلے گی اور تب آپ کو کسی کا خیال نہیں آتا۔ صرف موت کا خیال آتا ہے۔

مجھے تب بھی اس تختے پر پڑے اُس کا خیال آیا تھا۔ نوروز کے نقش سجاتی، اُٹھتے ہوئے لڑکھڑاتی، اُس کا خیال آیا تھا۔

مجھے بائی پاس آپریشن سے پیشتر نہ کسی دوست یار کا نہ ماں باپ اور نہ ہی بھائی بہنوں کا خیال آیا تھا، صرف اس کا آیا تھا جو اس لمحے میرے سینے پر وہی گل بوٹے اُلیکتی محسوس ہوتی تھی۔ اپنے موم ہونٹ میرے بدن پر پگھلاتی محسوس ہوتی تھی۔

آپریشن کے دوران بدن میں دھیرے دھیرے سرایت کرتے بے ہوشی کے بخارات مجھے ایک ایسی غنودگی میں لے جا چکے تھے جس میں رہی تو بے خبری رہی۔ تب میری پسلیوں کو ایک آری سے کاٹ کر اُن کے اندر دھڑکتے دل کو ایک مشین کے سپرد کر دیا گیا اور شریانوں کی مرمت اور منتقلی کے مرحلے گزرے، بے خبری رہی۔ تب میرا دل خود سے تو نہ دھڑکتا تھا ایک مشین کے تعاون سے دھڑکتا تھا تو مجھے یقین ہے کہ نوجوان کارڈیک سرجن کو بھی کچھ شائبہ سا ہوا ہوگا کہ ان بابا جی کے دل پہ کوئی نازک ملوک سا سایہ ہے۔ ذرا لڑکھڑاتا ہوا۔

ہر نوجوان کی مانند میں بھی نوخیزی کے بے اختیار خمار اور سلگتے بدن کے بخار سے باہر آ گیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد رزق روزگار کی تلاش کی کڑی دھوپ نے سارا نشہ اُتار دیا اور میں بھی زندگی بسر کرنے کے وسیلوں کے حصول کی خاطر چوہوں کی اس دوڑ میں شامل ہو گیا جس میں بروقت شامل نہ ہونے والے، خواب دیکھنے والے، چوہوں کی مانند ہی مارے جاتے ہیں اور وہ جو ہم اُن گلیوں میں کبھی دن سے رات کرتے تھے، کبھی اس سے بات کرتے تھے اور کبھی اس سے بات کرتے تھے روزگار کی بھول بھلیوں میں وہ گلیاں گم ہو گئیں۔ آنا جانا چھوٹ گیا۔

اُن گلیوں سے جدائی کے ایام میں، اکثر کسی شادی بیاہ کی تقریب میں، کبھی انگلیوں میں سے کھجور کی گٹھلیاں گراتے، کسی موت پر، ٹریفک کے سرخ سگنل کے سبز ہونے کے انتظار میں، کوئی فلم دیکھتے یا کسی گیت کو دھیان میں اُتارتے۔ یک دم بغیر کسی پیشگی اعلان کے یک دم میرے بدن میں ایک لڑکھڑاتی برچھی کھب جاتی...... میرا سانس رُک جاتا۔ شادی کے خیمے میں آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی نمائش روشنیوں کے فیوز اُڑ جاتے، وہ بجھ جاتیں۔ کھجور کی گٹھلیاں میری مٹھی سے یکبار چٹائیوں پر گر کر بکھر جاتیں۔ ان پر پڑھے جانے والے کلمے میری یادداشت سے خارج ہو جاتے۔ ٹریفک کے سب سگنل سیاہ ہو جاتے۔ میں سینما ہال سے باہر آ جاتا سانس لینے کے لیے اور میرے کان بہرے ہو جاتے، وہ گیت ایک سناٹے میں دفن ہو جاتے...... میرے اندر اُس کی یاد ایک اتھری منہ زور گھوڑی کی مانند باگیں تڑانے لگتی مجھے محسوس ہوتا کہ جیسے وہ خود اپنے موم ہاتھوں سے ان باگوں کو اتنی شدت سے کھینچتی ہے کہ میری باچھیں چرنے کو آتی ہیں۔ ان میں سے خون رسنے لگا ہے جو میرے حلق میں اترتا ہے تو مجھے ابھی اسی لمحے میں جہاں کہیں بھی ہوں، ایک مخمل کرب میں یا ایک تقریب سوگ میں، یہاں سے اُٹھ کر ابھی اُس گلی کو جانا ہے۔ بے شک یہ دن نوروز کے نہیں، پھر بھی مجھے جانا ہے۔ میرے بدن میں کھب چکی اُس کے موم چہرے کی برچھی مجھے چین نہ لینے دیتی۔ پر اس کی کھبن سے مجھے اذیت نہ ہوتی۔ ایک ایسی راحت میرے سراپے کو سرشار کرتی کہ میں پھر سے سانس لینے لگتا۔ میں نے شادی میں بندھے جانے سے انکار کر دیا۔ باروزگار اور مدبر، تیس برس کی قربت میں، میرے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں ایک اور سفید لکیر جو صرف تیز دھوپ میں ان کی سیاہی میں سے نمایاں ہوتی تھی۔ جب میرے والدین نے بجا طور پر اپنا منصبی فرض ادا کرنے کی خاطر یہ مناسب جانا کہ مجھے بیاہ دیا جائے اور میں نے انکار کر دیا۔

''مانی! اگر تمہاری اپنی کوئی ذاتی پسند ہے جس کی وجہ سے تم تامل کرتے ہو تو بتا دو۔ ہم معترض نہیں ہوں گے۔''

''مجھے کچھ مہلت درکار ہے۔'' مجھے خدشہ تھا کہ وہ بیاہی جا چکی ہوگی۔

ایک مدت بعد جب میری نوخیزی کی وحشت کے خمار اُتر چکے تھے۔ میں اُس گلی میں گیا۔ میرے دل میں کچھ خدشہ نہ تھا کہ ان برسوں میں میرے زمانے کی دیگر لڑکیوں کی مانند وہ بھی بیاہی جا چکی ہوگی اور اب اپنے متعدد بچوں کے پوتڑے کے ان زمانوں میں ابھی ڈائپرز ایجاد نہ ہوئے تھے۔ مل مل کے دھو دھو کے الگنی پر سکھاتی ہوگی۔ یہ امکان کم کم تھا۔ اگر رتی سدھوا ایسی گلوں میں اپنے گورے گالوں کے رنگ بھرنے والی صحت مند بھرے بدن کی لڑکی مناسب پاری برنہ ملنے پر اپنی بالکونی میں بیٹھی بیٹھی خزاں آلود ہوتی جاتی

تھی تو پھر ایک چلتے ہوئے گرتی پڑتی لڑکھڑاتی معذور موم کی گڑیا کے ساتھ کس نے بیاہ کرنا تھا، تو مجھے یہ خدشہ نہ تھا جب میں ایک مدت کے بعد اس گلی میں گیا۔

اس پارک کی سویر میں اپنے پرندے کے ساتھ راز و نیاز کرنے کے بعد اپنے بیٹے کی آمد کا منتظر میں اپنے ماضی کی اونگھ میں کچھ خوابیدہ سا ہوا جاتا ہوں۔ تو اگر آس پاس عقیدے کی رعونت میں پُرتکبر کوئی شخص میرے خیالوں تک رسائی نہ حاصل کر سکے تو میں ایک اقرار کرلوں؟

برسوں بعد اس گلی میں قدم رکھنے سے پیشتر میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر وہ جو میرے وجود سے تو کیا میری شکل سے بھی واقف نہیں۔ اگر وہ میری پیشکش کو محض اس لیے ٹھکرا دے کہ وہ روایت کے مطابق ایک غیر مذہب کے انسان کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی تو میں...... اگر وہ مان جائے تو اس کا عقیدہ اختیار کرلوں گا۔ یہ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ زرتشت پیغمبر کا کلمہ پڑھ لوں گا۔ اللہ اور ابلیس کی بجائے آہورا مزدا اور اہرمن پر ایمان لے آؤں گا۔ میں اس کے لیے بے ایمان ہو جاؤں گا۔

ہولے سے اُن چار سیڑھیوں پر ایک گمشدہ زمانے کے پہرے دار دروازے پر میں نے ہولے سے دستک دی۔ اُن سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے میں نے احتیاط کی۔ اگرچہ وہاں ان گُل بُوٹوں کا نام و نشان نہ تھا۔ تب بھی میں نے احتیاط کی کہ اُن معدوم ہو چکے نوروز کے نمائشی پھول پتوں کو بھی نہ روندوں۔

میرا دل جو نیا نکور تھا آج کی مانند مرمت شدہ نہ تھا۔ بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جیسے میں نے عرش کے کسی مقفل دروازے پر دستک دی ہو اور اگر یہ کھلے گا تو اس کے اندر میرا شہر تمنا لڑکھڑاتے دکھائی دے جائے گا۔

ایک ادھیڑ عمر برف سفید بالوں والے شخص نے جس کی سفید بھنوئیں اُس کی آنکھوں کو ڈھانکتی تھیں۔ دروازہ کھولا...... جی؟

میں تو اُس کے نام سے بھی واقف نہ تھا جو میرے اندر ایک دائمی نقش تھی۔

''جی؟'' اس نے پھر کہا۔

مجھے کچھ نہ سوجھا کہ استفسار کس صورت کروں۔ مجھے کچھ تو کہنا تھا ''جناب! یہ گھرانہ پارسی لوگوں کا ہے؟''

وہ اس سوال پر متعجب ہوا بھنوؤں کی سفید جھالر میں پوشیدہ ہوتے کو آنکھیں متعجب ہوئیں۔ ''آپ کیوں پوچھتے ہیں؟''

میری ہمت بندھی ''وہ...... ادھر انہی سیڑھیوں پر نوروز کو خوش آمدید کہنے کے لیے رنگ رنگ کے پاؤڈر سے پھول بوٹے چھڑکتے تھے۔ میں...... انہیں جانتا ہوں۔ ان میں سے کسی کو ملنے آیا ہوں...... کسی کو بھی......''

''وہ رُخصت ہو چکے......'' اس کی متعجب آنکھوں میں تأسف کا ایک سایہ اُترنے لگا۔ ''انہیں یہاں بھی پناہ نہ ملی۔ اُن کی بے انت نسلیں اسی شہر میں پیدا ہوئیں اور یہیں مردہ ہو کر گدھوں کی خوراک بنیں لیکن ایک نام کی مذہبی ریاست میں ایسے آتش پرستوں کے لیے گنجائش نہ تھی۔ وہ ایک اور ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ اتنے ہی لاہوریے اور ٹھیٹھ پنجابی تھے جتنے کہ میں اور آپ ہیں۔ بلکہ کچھ بڑھ کر کہ ہم میں سے بیشتر تو پچھلے چالیس پچاس برسوں میں ادھر اُدھر سے آ کر یہاں بس گئے تھے اور وہ صدیوں سے اس شہر کے باسی تھے۔ ان کے لیے گنجائش نہ رہی، وہ چلے گئے...... جانا نہ چاہتے تھے پر مجبور ہو گئے۔ بکھر گئے، یورپ، امریکہ اور بیشتر آسٹریلیا کی سرزمینوں پر......''

میرے قدموں تلے سیمنٹ کی جو بے رنگ سیڑھی تھی اُس میں سے وہی گل بوٹے، رنگین نقش اور گل بہار سجاوٹیں پھوٹنے لگیں۔ وہ نقش اور پھول پتے بجھے نہ رہے۔ سیمنٹ کی قید میں سے پھوٹ کر میرے قدموں سے لپٹتے میرے پورے وجود میں جڑیں پکڑتے گئے۔ یہاں تک کہ میرا دم رُکنے کو آیا۔

''آپ شاید بیرٹ کنبے کے جاننے والے ہیں۔ یہ فلیٹ میں نے انہی سے اونے پونے داموں میں خریدا تھا کہ وہ جلد از جلد منتقل ہو جانا چاہتے تھے۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں اور تینوں شاید آپ جانتے ہی ہوں گے نیم اپاہج تھیں۔ وہ اپنا سامان باندھتے ہوئے بھی گرتی پڑتی تھیں اور روتی تھیں۔ ان میں سے جو سب سے چھوٹی اور سب سے نازک تھی جس کا چہرہ موم کا بنا ہوا لگتا تھا، وہ زیادہ روتی تھی۔ وہ رُخصت ہو چکے۔''

مجھے زندگی سے کچھ شکایت نہیں۔ میں اپنی مہلت ختم کرنے کا خود ہی اعلان کر کے سرنگوں ہو گیا۔ جس لڑکی کو انہوں نے میرے لیے منتخب کیا اُس نے عمر بھر میری اطاعت کی۔ ایک خاموش بے زبان محبت کی۔ مجھے فرمانبردار اور مطیع اولاد سے نوازا۔ مجھے کچھ گلا نہیں۔ میں نے ایک آسودہ اور مطمئن حیات

گزاری ہے جس کے لیے میں اپنی بیوی کا ممنون ہوں۔

اتنے برسوں، نصف صدی پر محیط رفاقت کے دوران میرا بھرم رکھا۔ ایک عورت چاہے وہ ہارورڈ کی گریجوایٹ ہو یا اُپلے تھاپنے والی ایک گھامڑ ہو اُس کے نسوانی دماغ میں ایک خصوصی خلیہ نصب ہوتا ہے جو یک دم بھڑک کر ہوٹر بجانے لگتا ہے اور وہ چوکنی ہو جاتی ہے جب اُس کا مرد کسی اور عورت کی جانب ایک ایسی نگاہ کرتا ہے جس میں بس ایک ذرہ التفات کا ہوتا ہے۔ دن میں درجنوں فون آتے ہیں لیکن اُس کے مرد کی آواز میں کسی ایک فون کو اٹینڈ کرتے ہوئے جو رتی بھر لرزش آ جاتی ہے تو اُس کے دماغ کا وہ خصوصی خلیہ یک دم متحرک ہو کر غل کرنے لگتا ہے۔

کوئی بھی عورت...... ہارورڈ یا اُپلوں والی جب اُس کا مرد اُس سے ہم بدن ہوتا ہے تو اس کا بدن دوہائی دینے لگتا ہے کہ ہم دونوں کے درمیان ایک اور بدن ہے جس کی سانسیں میری نہیں، اس کی سانسیں میرے مرد کی سانسوں میں مدغم ہوتی ہیں اور جب وہ اپنے عروج کے رُکے ہوئے آبشار کو مزید نہیں روک سکتا اُس کے اُبلنے پر وہ اس عالم بے خودی میں بے اختیار ہو کر ذرا جھجک کر میرا نام لیتا ہے۔ پر اُس جھجک میں پوشیدہ کوئی اور نام ہوتا ہے۔

اتنے طویل برسوں کی رفاقت کے دوران میری بیوی نے میرا بھی بھرم رکھا۔ ہم دونوں کے درمیان ہمہ وقت ایک موجودگی جو لڑکھڑاتی پھرتی تھی اُس کا کچھ شکوہ نہ کیا۔ آج بھی وہ حسب معمول اگرچہ وہ بھی تنزل کی آخری شکستگی پر پاؤں دھر رہی ہے، مجھ سے پہلے منہ اندھیرے بیدار ہوئی، وضو کے لیے پانی نیم گرم کر کے میرے سرہانے رکھ دیا۔ مصلے بچھا کر اُس کے چاروں کونے ہموار کیے کہ اگر ان میں سے ایک کونہ بھی ذرا اُٹھا ہوا ہو، سمٹا ہوا ہو تو میں دل جمعی سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ کن اکھیوں سے اُس کونے کو تکتا رہتا ہوں۔ مصلے کے برابر میں رحل پر اُس صفحے پر کھلا قرآن پاک جہاں تک میں نے کل فجر کی نماز کے بعد تلاوت کی تھی۔

وہ نہ صرف بھرم رکھتی ہے بلکہ میرا دھیان بھی رکھتی ہے۔ میں جب گھر واپس جاؤں گا تو ناشتے کے لیے گرم بھاپ چھوڑتے دودھ میں خلیفہ کی باقر خانی کی ملائمت گھل رہی ہوگی۔

بہت بار میں نے اسے بتانے کی کوشش کی کہ بھلی لوک تم میری خلوت میں داخل ہونے والی پہلی اور آخری عورت ہو تو ایک موہوم خیال تمہارا رقیب نہیں ہو سکتا۔ بے شک اُس کی موجودگی درمیان میں رہتی ہے۔ موجودگی برحق لیکن میں تو اُس کے نام سے بھی آگاہ نہیں ہوں۔ چہ جائیکہ میں نے اُسے کبھی چھوا یا اُس کے بدن سے آشنا ہوا۔ وہ تو میرے وجود سے بھی واقف نہ تھی۔ پھر بھی میں جھجک جاتا، گفتگو کا رُخ کسی اور جانب موڑ دیتا۔ ایک عورت کے لیے، کسی اور کو چھونا نہ چھونا...... بدن آشنا ہونا، نہ ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اگر ان دونوں کے درمیان ہمہ وقت ایک موہوم موجودگی اگر محض ایک خیال ہے تو یہ صورت حال اُس کے لیے اتنی ہی اندوہ ناک اور ناقابل برداشت ہوگی جتنی کہ ایک گوشت پوست کی حقیقی عورت کے ساتھ مکمل سپردگی اور بدنوں کے ملاپ سے اُٹھتی بھاپ...... بلکہ کہیں زیادہ اذیت ناک......

تو میں جھجک جاتا۔

نہ صرف لکشمی مینشن کا وہ گلشن اُجڑ گیا۔ جتنے شوخ اور زندگی کے قوس قزح سے مزین رنگ رنگ کے گل بُوٹے تھے ان کی جڑیں اُکھڑ گئیں، کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ جو دھوپ میں بدرنگ ہوتی سیمنٹ کی سیڑھیاں ہیں ان پر کبھی نوروز کی مست بہاریں اُترتی تھیں۔ سب رُخصت ہو گئے۔ اپنا اتہ پتہ بھی دے کر نہیں گئے۔ جانے انہوں نے پرائے دیسوں کی مٹی میں دوبارہ جڑیں پکڑی ہیں یا نہیں...... موم کے چہرے وہاں پگھل نہ گئے ہوں۔

شادی کے چند برسوں بعد ہم تینوں میں سے ایک مسکیٹر سلیم بیگ جو کب کا اپنے ساحل چھوڑ کر امریکہ میں سکونت اختیار کر چکا تھا ایک مدت بعد واپس آیا تو ہم دونوں گئے وقتوں کی کھوج میں ایک شام گڑھی شاہو کی جانب جا نکلے۔ وہاں ہمیں حسب آرزو کچھ بھی نہ ملا۔ رابرٹ چوہدری کا وہ کوٹھڑی نما کمرہ جس کے اندر کبھی...... بتھوون کا مون لائٹ سناٹا اپنی اداس اور دل پذیر دُھن سے اُس کوٹھڑی کو چاند کے قریب کرتا تھا...... وہ کوٹھڑی ڈھے چکی تھی۔ مجھے گمان ہے کہ رابرٹ چوہدری اور اُس کا گرینڈ پیانو اُس کے ملبے میں دفن تھے۔

کوئی ایسا دروازہ کھلا نہ تھا جس کے اندر سے والٹز یا کوئیک سٹیپ کی دُھنیں باہر گڑھی شاہو کے فٹ پاتھ پر چلنے والوں کے قدم روکتی ہوں۔ یہاں کے باسی بھی کوچ کر چکے تھے لیکن یہ بستی نارتھ ویسٹرن ریلویز کے اینگلو گارڈز، انگریز انجن ڈرائیوروں اور دیگر عملے کی گڑھی البتہ ویران نہ تھی بلکہ پہلے کی نسبت

کہیں زیادہ پررونق اور متمول ہو چکی تھی۔ اس کے فٹ پاتھوں پر اٹھنے والے قدم بیٹھووں کی موسیقی سے نہیں، بصد یق تو مچھلی کی تلتی ہوئی خوشبوؤں سے وجد میں آتے تھے۔ یہاں متعدد نہایت شاندار اور دیکا چوند مٹھائیوں کی دکانیں کھل چکی تھیں اور اہل شہر ان کی لذتوں کے خیال میں سرشار سرشام ادھر کا رُخ کرتے تھے۔ تلی ہوئی مچھلی اور دیسی گھی کی مٹھائیوں کی دکانوں کی دیواروں پر مقامات مقدسہ کی تصاویر اور آیات کے چوکھٹے آویزاں تھے۔ خصوصی فرمائش پر کسی خوش الحان قاری کی قرأت میں گاہک کی روحانی اشتہاء کے لیے معاون ثابت ہوتی ہیں۔

برٹ انسٹیٹیوٹ کی کولونیل عمارت ابھی تک موجود تو تھی لیکن اس کے دروازوں پر پڑے قفل زنگ آلود ہو رہے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اسے جھاڑ پونچھ کر مقامی مچھلی فروشوں اور سویٹ مرچنٹ کے تعاون سے یہاں ایک محفل حمد و نعت منعقد کی گئی تا کہ ماضی میں اس کے چوبی فرش پر کرسمس اور نیو ایئر کے مواقع پر رقص و سرود اور لہو و لعب کے جو مظاہرے ہوتے تھے ان کا کچھ مداوا ہو سکے۔

وکٹوریہ پارک کی کبھی سیاہ کبھی گندمی رنگتیں، سفید شلواروں، ٹی شرٹوں اور فلیٹ بوٹوں والیاں بھی اپنے بیڈمنٹن کے ریکٹ گھماتی کہاں چلی گئی تھیں۔ ان کے لیے بھی اس پوتر سلطنت میں گنجائش نہ رہی تھی۔

وکٹوریہ پارک کی ہواؤں میں ایک مدت سے کوئی شٹل کاک اُچھلی نہ تھی۔ لاہور کی آرٹ گیلری میں آویزاں تصویروں کے سب شوخ اور بھڑکتے رنگ معدوم ہو چکے تھے۔ اگر رہی تو بے رنگی رہی۔

اس وسیع پارک کے جوگنگ ٹریک کے گرد جو قدیم شجر ہیں ان کے تنے بھی متشرع ہو چکے تھے۔ ہر تنے پر اللہ تعالیٰ کے مقدس ناموں کی ٹین کی پلیٹیں ٹھونک دی گئی تھیں۔ تاکہ ٹریک پر سیر کرتے، جوگنگ کرتے یا اپنی چال چلتے لوگ ان پر نظر کرتے، ناموں کا ورد کرتے اپنی عاقبت سنوار سکیں۔

جن دنوں مجھ میں ابھی سکت تھی میں اس ڈھائی کلومیٹر کے ٹریک پر کم از کم دو چکر لگا لیتا تھا۔ تب ایک روز میں ٹریفک کے اصولوں کی پابندی کرتا ہوا بائیں جانب چلتا جاتا تھا جب سامنے سے آتے ایک صاحب نے سرزنش کی کہ بائیں جانب چلنا اسلام میں ممنوع ہے۔ اس لیے کہ بایاں ہاتھ پلید ہوتا ہے۔ میں نے بحث نہ کی دائیں ہاتھ پر چلنے لگا۔

اس پارک میں ایک معصوم اور بھلے سے باریش شخص نے انتظامیہ کو مجبور کر دیا کہ یہاں جتنی بھی گھنی جھاڑیاں اور گل بوٹوں کے قدرے پوشیدہ گوشے ہیں انہیں کٹوا دیا جائے کہ ان کی اوٹ میں گناہ کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ یہی معصوم سے شخص اور میں واقعی ان کی عزت کرتا تھا۔ ایک مدت ہر کس و ناکس کو ایک ڈبیا میں محفوظ مردہ کینچوے کی مانند سکڑا ہوا ایک ربڑ دکھا کر کہتے تھے کہ یہ میں نے پارک کے فلاں جھنڈ میں سے دریافت کیا ہے۔

زمانے بدل گئے ہیں۔ عمر کے پلوں تلے ساٹھ ستر برس اور کیسے کیسے رنگ پانیوں میں گھل کر بہہ چکے ہیں۔ میں اپنی بجھتی آنکھوں سے یہ زمانے دیکھتا ہوں۔ سب تصویریں یک رنگی ہو چکی ہیں۔ اگر میں ان زمانوں کا ذکر کروں جب یہ شہر رنگ رنگیلا، البیلا اور مسرتوں سے سرشار ہوا کرتا تھا اور تب بھی میں نماز کا پابند قرآن کا قاری تھا تو اس کے باوجود آج میں مردود کہلاؤں تو میں کیوں ذکر کروں۔ بس وہ ایک نادیدہ پرندہ ہے...... پارک کے قدیم ترین برگد میں پوشیدہ۔ جس کے سامنے ایک مجذوب کھڑا ہو گیا تھا کہ مت کاٹو۔ اگر کاٹنا ہے تو مجھے کاٹو۔ اس لیے وہ موجود ہے جسے میں شریک کر سکتا ہوں کہ وہ میری مخبری نہیں کرے گا۔

شاید مجھے کوئی جھنجھوڑ رہا ہے۔ آنکھیں کھولتا ہوں تو ایک دُھندلا سراب ہے۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔ ان میں فنا کی تاریکی اُترتی محسوس ہوتی ہے۔ پارک کے سب شجر...... گل بوٹے...... معدوم سے ہوتے جاتے ہیں۔ شاید یہ میرا بیٹا ہے جو مجھے پکارتا ہے، جھنجھوڑ رہا ہے۔ میں جواب دینا چاہتا ہوں پر میری زبان پر ایک ایسی زردی اُتر رہی ہے جس میں سرسوں کے پھولوں کی مہک ہے۔ حرکت کرنا چاہتا ہوں لیکن میرے رگ و پے میں ایک سیاہی چھانے لگی ہے۔ جو مجھے حنوط کرتی ہے۔

سب کچھ فنا...... کل کائنات اس پارک سمیت سپرد فنا...... ہر شے معدوم

بس ایک نقش کو ثبات ہے۔ اُٹھتے ہوئے لڑکھڑاتا...... نازک ملوک موم سے تراشیدہ ایک نقش...... بجھتی ہوئی آنکھوں میں آخری نقش...... موم کی ایک اپاہج وینس ڈی میلو

احمد عقیل روبی

ڈاکٹر خورشید رضوی

احمد عقیل روبی کا نام پہلی بار میں نے اُس وقت سُنا جب میں ۱۹۶۲ء کے اوائل میں لیکچرار کی حیثیت سے گورنمنٹ انٹر کالج بہاولپور میں تعینات ہوا۔ اُن کا غائبانہ ذکر سید آلِ احمد مرحوم نے کیا۔ وہ رُوبی کا نام بڑی محبت سے لیتے تھے۔ اگلے سال کے آغاز میں مَیں بہاولپور سے سرگودھا آ گیا اور پھر بیس بائیس برس کے لئے وہیں کا ہو رہا۔ اس عرصے میں بھی عقیل روبی کا نام گاہے گاہے سننے میں آتا رہا۔ مگر ملاقات کا موقع بہت بعد میں ملا جب میں ۱۹۹۱ء میں خود گورنمنٹ کالج لاہور آیا۔ وہ اس وقت ایف سی کالج میں تدریسی فرائض انجام دے رہا تھا۔

احمد عقیل روبی کی شخصیت میں ایک دھیمی گرم جوشی تھی جو اُسی کے بطونِ ذات میں جگمگاتے ہوئے خلوص اور محبت سے پھوٹتی تھی۔ وہ اپنے دل کی گہرائی سے بولتا تھا اور خود اپنی باتوں کی سرشاری میں ڈوب جاتا تھا۔ اُس کی چمکتی ہوئی آنکھیں اور اُس کے ہونٹوں سے کچھ فاصلے پر اُبھرا ہوا بڑا سا تل اُس کی گفتگو میں شریک رہتے تھے۔ کالرج کے Ancient Mariner کی طرح وہ سننے والے کو اپنی نگاہ کے سحر میں جکڑ لیتا تھا۔ انتظار صاحب نے بجا طور پر اُسے اپنے زمانے کا میر باقر علی داستان گو قرار دیا ہے۔ تاہم اُس کی طبیعت میں ایک فطری انکسار تھا اور وہ دوسروں کی بات بھی نہایت انہماک سے سنتا تھا۔

جان کیٹس کی طرح احمد عقیل روبی کا جزیرۂ خواب بھی یونان کی سرزمین اور وہاں کی دیو مالا تھی۔ اُس کی تحریروں اور تقریروں میں یونان کے ادبی اور اساطیری حوالے کسی نہ کسی بہانے در آتے تھے۔ مگر اُس کی بات میں حرفِ مکرر کی ملال انگیزی نہ تھی جس کا سبب اُس کی طبیعت کا تنوع تھا جو اُسے یونان کے علاوہ اور بھی ہزار وادیوں میں لئے پھرتا تھا۔ وہ علمی اور فلمی دونوں حلقوں میں یکساں طور پر ہردلعزیز تھا۔ اُس کے قلم سے ایک بوقلمونی پھوٹتی تھی۔ اُس نے شاعری بھی کی، نثر بھی لکھی، فکشن اور تمثیل کی دنیا میں بھی قدم رکھا، ترجمے بھی کئے، خاکے بھی لکھے اور ہر کام ڈوب کر کیا۔ اُس کا لکھا ہوا خاکہ بہت زندہ اور متحرک ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ناصر کاظمی پر لکھا ہوا اُس کا مفصل خاکہ میں نے ہاتھ میں لیا تو بس پڑھتا ہی چلا گیا۔ ختم کیا تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے اور ناصر کاظمی گویا میرے کمرے میں موجود تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اُس روز رُوبی کے اہلِ خانہ کسی اور شہر گئے ہوئے تھے اور وہ گھر میں اکیلا تھا۔ خاکے کا تاثر اتنا بھرپور تھا کہ میں نے اُسی وقت فون اُٹھایا اور اس کا نمبر ملا دیا۔ رات کے ڈھائی بجے فون کی گھنٹی بجنے پر وہ پریشان ہو گیا۔ میری آواز سن کر اُس نے گھبراہٹ میں میری خیریت پوچھی۔ میں نے کہا:

احمد عقیل روبی / ہے تم میں ایک خوبی / لکھتے ہو تم جو خاکہ / ہوتا ہے وہ بلا کا / جیسے وہ شخص اُٹھ کر / یاں سے ابھی گیا ہے

کانوں میں اُس کی باتیں / رہ رہ کے گونجتی ہیں / آنکھوں میں اُس کا نقشہ / رہ رہ کے گھومتا ہے

یہ فی البدیہہ داد سن کر عقیل روبی سرشار ہو گیا اور کہا کہ یہ مجھے لکھوا دیں۔ پھر اُس نے یہ برجستہ منظوم تاثر نوٹ کیا اور بعد میں اپنی کتاب پر بطور فلیپ درج کرایا۔

احمد عقیل روبی کے تنوع نے ایک اور غیر متوقع معرکہ بھی سر کیا۔ وہ ایک روز مجھے اورینٹل کالج میں ملا اور کہا کہ میں نے قرآن مجید کے تیسویں پارے کا منظوم ترجمہ کر لیا ہے اور اب اُسے شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ اس کے لیے ایک فلیپ لکھ دیں۔ مجھے اُس کی اس فرمائش سے ایک طرح کی گھبراہٹ محسوس ہوئی کیونکہ مجھے تو قرآن کا نثر میں ترجمہ کرنے کا بھی حوصلہ نہیں پڑتا کجا یہ کہ نظم میں یہ جرات کی جائے۔ میں نے کہا عقیل روبی! یہ تو بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ روبی اپنی ماں کی شخصیت اور عظمت کا بڑا مداح تھا۔ اس نے کہا میری ماں قرآن پڑھی ہوئی نہیں تھی مگر قرآن مجید سے والہانہ عقیدت کے سبب ہر ہر سطر پر اُنگلی پھیر کر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھتی تھی اور اسی طرح قرآن شریف ختم کرتی تھی۔ وہ مجھ سے کہا کرتی تھی بیٹا! مجھے اردو میں لکھ دے کہ قرآن میں کیا لکھا ہے۔ اس ترجمے کا محرک میری ماں کی یہی

خواہش ہے۔ میں اُس کی اس بات سے بہت متاثر ہوا اور ترجمے پر ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر ایک محتاط سا فلیپ لکھ دیا اور اُسے پھر یاد دلایا کہ یہ کام بہت نازک ہے۔ میرے پاس حرفاً حرفاً مقابلہ و موازنہ کرنے کا وقت نہیں مگر وہ عربی جاننے والے کسی نہ کسی دوست کو تفصیلاً یہ ترجمہ ضرور دکھا لے۔

اسی حوالے سے ایک روز وہ میرے گھر بھی آیا تو میں نے ایک آدھ لفظ کے بارے میں عربی کے دو ایک بڑے لغت سامنے رکھ کر بتایا کہ دیکھیں، اس ایک لفظ میں پہلوداری کی کیسی دھنک ہے۔ ترجمے میں زیادہ سے زیادہ دو ایک پہلو سمٹ سکتے ہیں اور ایک ذرّے کو سنبھالتے سنبھالتے گویا ایک صحرا رہا جاتا ہے۔ میں نے کہا بھائی احمد عقیل روبی تم نے یہ ترجمہ کر ہی اس لیے لیا ہے کہ تمھیں ان کٹھناؤں کا شعور نہیں تھا۔ پھر میں نے اُسے ایک کہانی سنائی کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار اُسے سرپٹ دوڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ سامنے ایک بستی کے لوگ جمع ہوتے چلے جا رہے ہیں اور آنکھوں پر ہاتھ کی اوٹ بنائے، عجیب تشویش کے عالم میں اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ ہنستا کھیلتا اُن کے پاس پہنچ کر گھوڑے سے اُترا اور کہا کیا بات ہے؟ آپ لوگ اس قدر پریشان کیوں نظر آ رہے ہیں؟ انھوں نے جواب میں صرف اُس کے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ اُس شخص نے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ جس راستے پر وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا تھا وہ دراصل ایک منجمد جھیل تھی اور اُس کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اُس کے پیچھے برف ٹوٹ ٹوٹ کر پانی نکلتا چلا آیا تھا۔ اگر کہیں اُس کی رفتار میں ذرا سی کمی ہو گئی ہوتی تو وہ اس یخ بستہ پانی میں غرق ہو چکا ہوتا۔ یہ منظر دیکھتے ہی وہ چکرا گیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

احمد عقیل روبی یہ کہانی سُن کر بہت محظوظ ہوا اور کہا کہ میرے اس ترجمے کی رونمائی ہونے والی ہے۔ آپ اس تقریب میں ضرور آئیں اور یہی کہانی وہاں سٹیج پر آ کر سنا دیں۔ میں اُس کی خواہش کی تکمیل کے لیے اس تقریب میں گیا۔ اُس روز کے شرکاء احمد عقیل روبی کے وسیع اور متنوع حلقۂ احباب کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان میں سے اداکار محمد علی اور مولانا غلام مرتضیٰ ملک اس وقت مجھے یاد آ رہے ہیں۔ میری باری آئی تو میں نے جا کر اپنا تاثر اور موقف بے کم و کاست بیان کر دیا اور وہ کہانی بھی سنا دی۔ میری گفتگو کے اختتام پر عقیل روبی خود اسٹیج پر آئے اور کہا حضرات ارضوی صاحب کی سنائی ہوئی اس کہانی سے میں نے ایک ہی سبق سیکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی کو مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ میں یہ کام، انشاء اللہ اسی رفتار سے جاری رکھوں گا اور ہرگز پیچھے مڑ کر نہیں دیکھوں گا۔

کچھ عرصہ بعد وہ جوہر ٹاؤن ہی میں اُٹھ آیا جہاں میری بھی سکونت تھی۔ کبھی کبھار بنک میں اس سے ملاقات ہو جاتی تو وہ ذکر کرتا کہ اب میں قریب ہی آ گیا ہوں کسی روز گھر دکھاتا ہوں۔ مگر اس دور کی بے مصرف مصروفیتوں نے عملاً یہ موقع کبھی پیدا نہ ہونے دیا۔

برادرم اصغر ندیم سید پر قاتلانہ حملہ ہوا اور وہ ڈاکٹرز ہسپتال میں داخل ہوئے تو میں ان کی مزاج پُرسی کو گیا۔ میں اُن سے حال احوال پوچھ ہی رہا تھا کہ اُن کے سرہانے کھڑے ایک دھوپ چھائیں سے پیکر پر نظر جا پڑی۔ میں چونک گیا۔ یہ تو احمد عقیل روبی ہے۔ میں نے بڑی تشویش سے اُس کی صحت کا حال پوچھا۔ مگر اس نے مجھے اپنی بیماری کی ہوا تک نہ لگنے دی اور بات کو ٹال کر ایک طرف ہو گیا۔ اس بیماری کی تفصیل مجھے تبھی معلوم ہوئی جب ایک روز اچانک اُس کے رخصت ہو جانے کی خبر ملی۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید دل نے بے وفائی کی ہو۔ مگر پھر احباب سے معلوم ہوا کہ حادثہ ایک دم نہیں ہوا۔

بہت دن سے / اس سربہ مُہر آتشیں راز کا
گنگ فیتہ / خموشی سے جلتا چلا جا رہا تھا / فنا کے
گرجتے ہوئے آبشاروں
کے اوپر تنا ریشموں کا یہ پل / ایک مدت سے
گلتا چلا جا رہا تھا

پنجابی

بیت بازی

مرتب

نازاوکاڑوی

صفحات: 160 قیمت: 300 روپے

ناشر

15/6 فضل سٹریٹ بخ پیر روڈ، نیو مزنگ لاہور

اُردو غزل......اقبالؔ کے فوراً بعد

خاور اعجاز

اس موضوع پر بات کرنے سے پیشتر ہمیں عربی قصیدے سے علیحدہ ہو کر فارس میں رواج پانے والی خواتین کے ساتھ گفتگو کے نام پر کہی جانے والی غزل کا ایک سرسری جائزہ لینا ہوگا تاکہ اقبالؔ اور مابعد کی غزل کے رجحانات کے موازنے کی راہ ہموار ہو سکے۔

غزل کو اہلِ فارس کی ایجاد کہہ لیں یا دریافت لیکن عربوں کی نسبتاً حقیقی شاعری کے مقابلے میں ایرانیوں کی تصوراتی شاعری کے رجحان نے غزل کو ادب میں ایک مستقل مقام عطا کیا۔ تاہم اوزان و بحور ایک عربی خلیل بن احمد بصری سے مستعار ہیں۔ بیشتر تشبیہات، استعارے اور دیگر محاسن عربی اور فارسی سے ہوتے ہوئے اُردو میں منتقل ہوئے۔ ہجر کی شب امراءالقیس کے ہاں بھی ویسی ہی ہے جیسی میرؔ کے ہاں۔ اُردو میں ظہور سے قبل اور شانہ بہ شانہ فارسی میں رودکی، سنائی، عطار، مولانا روم، سعدیؔ اور حافظ غزل کے مختلف پیمانے وضع کر چکے تھے جن کی روشنی میں عرفی، نظیری، صائب، کلیم اور طلب آملی چلے۔ بعد ازاں فغانی نے اپنے زمانے کی غزل میں جدتیں پیدا کیں اور انہی شاعروں کے ملے جلے تصوف، اخلاق، فلسفہ اور عشق و عاشقی کے مضامین اردو میں بھی آئے۔ تاہم اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شعراء نے ایک کاہلی کا ثبوت دیا کہ عشقیہ مضامین کو ہی متصوفانہ شاعری کی بنیاد بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حافظ جیسا شاعر بھی کئی مواقع پر شراب کا جام تھامے مسجد و کعبہ میں مست پایا گیا ہے یعنی کئی اشعار میں شراب جامِ کوثر بننے کی بجائے شیراز کے میخانے میں ہی رہ گئی ہے اور ان اُبھرے اشعار سے کوئی دوسری اعلیٰ سطح برآمد نہیں ہوتی اور ساقی کے پردے سے کوئی مرشدِ کامل یا عارف نکلنے کی بجائے وہی پیالہ و ساغر کا دلدار نکل آتا ہے! ہاں یہ ضرور ہوا کہ تصوف کی لہر نے بعض دوسرے ارفع مضامین کے لیے راہ ہموار کی جیسے تصورِ خدا، فانی اور لافانی زندگی کا بیان وغیرہ۔

اردو غزل فارسی کی گود میں پلی بڑھی اور آدھی فارسی اور آدھی اردو کی توتلی زبان بولتی ہوئی ولی دکنی کے ہاتھوں جوان ہوئی۔ اس سے پیشتر قلی قطب شاہ اور حسن شوقی اسے پاؤں پاؤں چلنا سکھا چکے تھے۔ محمد حسین آزادؔ اور الطاف حسین حالیؔ نے فرسودہ غزل کے سانچے تبدیل کرنے اور نئے خیالات کو نظم کے ذریعے اُجاگر کرنے میں کلیدی رول ادا کیا۔ اس تحریک میں اسماعیل میرٹھی، نظم طباطبائی، شوق قدوائی، عبدالحلیم شرر، نادر کاکوروی، اور سرور جہاں آبادی نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور غزل کے مقابلے میں نظم کو ترجیح دی۔ اس تحریک نے غزل کو اتنا دبا دیا کہ اس کے ردِعمل میں دہلی میں بےخود، نوحؔ، سائلؔ اور لکھنؤ میں صفی، عزیزؔ اور ثاقبؔ وغیرہ کو باقاعدہ غزل کے دفاع میں کمربستہ ہونا پڑا۔ اس منظرنامے کا آغاز حالیؔ کی شاعری سے ہوتا ہے۔

حالیؔ کی غزل اس بات کی شاہد ہے کہ منصوبہ بند شاعری اپنی صنف کی ایمائیت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ تاہم اُس کی وعظ و تلقین نے غزل کے رہن سہن میں ایک تبدیلی کا آغاز ضرور کیا اور اس اصلاح پسندی نے قدیم سماجی رویوں میں ایک نیا فکری رویہ متعارف کرایا۔ شاعری اور تخلیقی نثر کے ساتھ اگر تنقید کو بھی شامل کر لیا جائے تو حالیؔ کا مرتبہ بعض دیگر عظیم ادبی شخصیتوں سے بھی بالا ہو جاتا ہے۔ حافظِ قرآن اور حضرت ابوایوب انصاری کے خاندان سے تعلق رکھنے والے حالیؔ نے تنقیدی شعور کی بنا پر غزل کو اپنے عہد کے عشقیہ مضامین سے نجات دلانے میں بڑا کام کیا۔ حالیؔ نے تخیل کی بجائے عمل کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور تقدیر کی بجائے تدبیر پر زور آیا۔ آیئے مختصراً دیکھتے ہیں کہ حالی کا مقصد کیا تھا۔

حالیؔ کے زمانے تک غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاقی مضامین عام ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود حالیؔ نے غزل کی مجموعی حالت کو ''ابتر'' بتایا ہے اور اس صنف کو ''بے سود'' کہا ہے۔ تاہم وہ غزل کا اس حد تک ضرور قائل تھا کہ مبسوط اور طولانی کلام لکھنے کے مواقع شاعر کو ہمیشہ میسر نہیں آتے۔ لہٰذا روزمرہ کے واقعات کے بیان کے لیے غزل کے بیت یا پھر قطعہ، رباعی بہتر آلہ کار ہیں۔ چونکہ قطعہ اور رباعی کی نسبت غزل کے شعراء بے شمار تھے اور غزل مذکورہ دونوں اصناف سے زیادہ عوام الناس میں مقبول تھی اور محافل میں گائی بھی جاتی تھی۔ اس لیے حالیؔ نے اس کی اصلاح پر زور دیا۔ دراصل حالیؔ یہ چاہتا تھا کہ غزل میں بوالہوسی اور چٹخارے کی جگہ خالص عشق و محبت اور سنجیدہ کلامی کی طرف توجہ دی جائے اور سعدیؔ، رومیؔ اور جامیؔ کی روایت کو تازہ کیا جائے۔ خمریات اور خلافِ شرع لوازمات سے حتی المقدور پرہیز کیا جائے۔ پاکیزہ خیالات کو فروغ دیا جائے اور متصوفانہ گفتگو میں اہلِ ظاہر سے محض انتقام کی خاطر لعن طعن نہ کی جائے۔ ذہن سے گھڑی ہوئی باتوں کی بجائے دل سے نکلی ہوئی باتوں کو ترجیح دی

جائے۔ دوسروں پر قناعت کی بجائے اپنے مشاہدے پر بھروسہ کیا جائے۔ شعر میں جدت پیدا کی جائے، نئے اور اچھوتے مضامین باندھے جائیں۔ باتوں میں تنوع، سادگی، صفائی، بے تکلفی اور وسعت ہونی چاہیے۔ تکرار اور اعادہ سے گریز کرنا چاہیے۔ البتہ پرانوں کے ہاں رہ جانے والی کسی کمی کو اگر نئے شاعر پورا کر دیں تو گوارا ہے۔ نئے اسالیب اور الفاظ کو آہستہ آہستہ بڑھایا جائے۔ روزمرہ کا لحاظ اور محاورے کی چاشنی رکھی جائے۔ زمینیں ایسی اختیار کی جائیں جن میں ہر قسم کے مضمون کی گنجائش ہو۔ یہ تھا وہ کچھ جو حالی غزل سے چاہتا تھا۔

حالی کی ذہنی پاکیزگی اس کی غزل میں بھی آئی ہے۔ علامتی انداز سے مسلمانوں کو اردگرد کے حالات سے آگاہ کرنے کا انداز ملتا ہے۔ اس کی غزل کے الفاظ سادہ لیکن کسک سے بھرے ہوئے ہیں۔ دل کی بات کی ہے لیکن متانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ شعر، زبان اور قوم کی اصلاح تینوں اس کے مدنظر رہے۔ اس ضمن میں جنگِ عظیم اوّل اور اس کے اثرات بھی قابلِ ذکر ہیں جن کے نتیجے میں برصغیر کا مزاج تبدیل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ وطنیت، قومی اور سیاسی بیداری کی ایک لہر جو اس جنگ کے بعد اُٹھی اس سے پیشتر اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ پھر مغرب میں ہونے والی سائنسی ترقی کے اثرات جہاں مشرق کی عمومی زندگی پر مرتب ہوئے وہاں ادب بھی ان سے مبرا نہ رہ سکا۔ اگرچہ ان تبدیلیوں کا واضح اظہار نظم میں بہتر طور پر ہوا لیکن غزل بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور پرانے لبادے اُتار پھینکے۔ آنکھ اب بادام سے تشبیہ پانے کی بجائے وہ کچھ دیکھنے لگی جو وہ اس سے پیشتر دیکھنے سے قاصر تھی۔

حالی کا شمار میر و غالب کے ساتھ نہ سہی لیکن دوسری سطح کے اعلیٰ ترین شعرا میں کیا جا سکتا ہے۔ غالب نے حالی کو یوں ہی تو نہیں کہہ دیا تھا کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنے آپ پر ظلم کرو گے۔ جذبۂ عشق اور حالی ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ خلوص اور پاکیزگی احساس حالی کا مزاج ہیں اور دھیما پن اور معصومیت اس کی غزل کی پہچان۔ حیرت آمیز سوز و گداز اس کے قلبی احساسات و کیفیات کو مزید روشن کر دیتا ہے۔

حالی کے ساتھ نظم نے بالخصوص اور غزل نے بالعموم ایک کروٹ لی۔ اس لحاظ سے وہ اردو شاعری میں جدیدیت کے پیشواؤں میں شمار ہوتا ہے۔ اگر حالی نہ ہوتا تو شاید اُردو شاعری زمانے کے نئے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لیے کسی اور کا انتظار کرتی۔ قومی اور ملی زندگی میں بھی حالی کی شاعری نے ہلچل پیدا کی۔ حالی کے خیالات اور شاعری میں قدیم سے جدید کی طرف پیش قدمی میں اُس کے قیام لاہور کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس دوران اُسے انگریزی ادب اور مغربی علوم کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملا۔

حالی کی تنقید نے غزل کی روایت میں تبدیلی پیدا کی اور اکثر مروجہ عشق و عاشقی کی مضامین کا رُخ قومی شعور کی طرف موڑا۔ وہ بذاتِ خود ایک مذہبی، صوفی منش اور قناعت پسند انسان تھا۔ ایک تہذیبی گھرانے میں آنکھ کھولی اور اپنے شوق کے تحت فلسفہ، منطق، حدیث، تفسیر اور صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ اوائل عمری میں شادی اور خاندانی پاکیزگی و طہارت کے زیرِ اثر حالی کی طبیعت پر سادگی اور صداقت حاوی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی روایتی اور رسمی شاعری سے اجتناب کرتا نظر آتا ہے۔ پھر غالب کے مشورہ و اصلاح اور شیفتہ کی صحبت نے اسے مبتذل اشعار کی جانب نہ جانے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غزل بی بی سے حالی کا معاشقہ نہ چل سکا اور

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

کے مصداق بعض اشعار محض تلقین واعظ (بقول عبدالماجد دریا آبادی) کے زمرے میں آگئے ہیں جیسے:

بڑھاؤ نہ آپس میں ملتے زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تاہم صنائع بدائع اور بے جا تشبیہات و استعارات سے گریز نے حالی کی غزل کو نئی کیفیات سے روشناس کرایا جو قومی بیداری اور ملی شعور سے مملو ہیں۔

حالی کی غزل گوئی اُس کی نظم نگاری اور خاص طور پر مسدس کے نیچے رکھ دی گئی ہے۔ حالانکہ غالب کی شاگردی اور شیفتہ کی صحبت میں ان کے ہاں قدیم رنگ میں بھی تغزل کی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں جن میں بے ساختگی، معصومیت اور دل گدازی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ پھر وہ داخلیت کے حصار سے ایسا باہر نکلا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا اور غزل کے بیشتر قدیم موضوعات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ مضمون آفرینی اور قافیہ پیمائی کر کے اُستادی کا رعب قائم کرنے والی شاعری سے تائب ہوا اور حقیقت نگاری کو وسعت دے کر اس میں وہ تپش بھر دی کہ شعور تمتما اُٹھا۔ حالی نے غزل کے مزاج میں بنیادی تبدیلی کی اور اس کے آہستہ آہستہ بدلنے کی راہ ہموار کر کے چھوڑ دیا۔ فرسودہ مضامین، صنعتوں، محاوروں، استعاروں اور تشبیہوں سے پرہیز کیا۔ حتیٰ کہ قافیوں تک سے اجتناب کو اپنایا اور غیر مردف غزل کو رواج دیا۔ غزل کے مصنوعی پن کو حقیقت کی طرف موڑا۔ وہ کام جو ایک باقاعدہ تحریک کا تقاضا کرتا تھا اُسے حالی نے تن تنہا اپنے ذمے لیا اور خوش اسلوبی سے نبھایا البتہ اتنے بڑے کام میں اگر فصاحت متاثر ہو بھی گئی تو

اُسے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ مولانا کے نئی شاعری کے شوق نے اگرچہ ان کی غزل کے دائرے کو محدود کیا لیکن خیالات کو جس پاکیزگی سے انہوں نے نظم کیا ہے وہ ہمعصر سوائے اقبال کے اور کہیں نظر نہیں آتا۔ حالی کے خلوص اور صداقت خیال پر اُنگلی نہیں اُٹھائی جا سکتی۔ اصلاح احوال اور تہذیبی بیداری میں اس کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حالی کی غزل میں اجتماعی اُداسی کی فضا ہے جب کہ اس کے معاصرین داغ و میر کے ہاں یہ رنگ ذاتی یا زیادہ سے زیادہ مجلسی ہے۔

آخری عمر میں غزل کی طرف رجحان بہت کم ہو گیا تھا اور ۱۸۹۳ء تا ۱۹۱۴ء یعنی ۲۱ برس میں صرف سات غزلیں کہیں اور دیوان (۱۸۹۳ء) کے دیباچہ میں یہ کہہ دیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے۔ تاہم وہ غزل کو حسن و عشق کے چنگل سے بڑی حد تک نجات دلا کر جدید رجحانات سے روشناس کرایا گیا۔ اس نے غزل کے مورچہ بند شعراء سے نہ صرف جنگ لڑی بل کہ فتح بھی پائی۔ یہاں غالب کی رائے یاد آتی ہے کہ ”اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے“ جدید اردو غزل کی ابتدا کا سہرا حالی کے سر بندھتا ہے۔ وہ قدیم روایات کا احترام کرتے ہوئے نئی اقدار کی تخلیقی سطح پر تشکیل کرتا ہے۔ تصنع کی بجائے قومی احساس اور سیاسی و معاشرتی شعور کا حاصل شعر کہا اور اُمید کی کرن دکھائی جس نے اقبال کی شاعری کو جگمگایا۔

غزل کی تاریخ میں حالی پہلا شاعر ہے جس نے نہ دیوان زادہ والے شاہ حاتم کی طرح نسبتاً نئے رجحانات کی ترجمانی کرنے والے اشعار کو رکھ کر باقی کلام قلم زد کر دیا اور نہ ناسخ کی طرح فقط الفاظ کی تراش خراش کے پیچھے پڑا رہا۔ نہ دلی والوں کی طرح جذبات کی ترجمانی میں مصروف رہا اور نہ لکھنؤ والوں کی طرح خارج میں ٹکریں مارتا رہا بلکہ حالی نے صدق دل سے غزل کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھا اور اسکی اصلاح کی بھرپور کوشش کی جس نے غزل کے امکانات کو روشن تر کر دیا۔ ذرا دیکھئے کہ حالی کے ہم عصر شعرا اُس وقت کیا کہہ رہے تھے: (جلال لکھنوی ۱۸۳۴ء-۱۹۰۹ء)

بتوں کو شوق ہوا عالم آشنائی کا
انہیں بھی رنگ پسند آ گیا خدائی کا
بہت ڈرتے ہوئے ملتے ہیں شیخ و زاہد سے
اُٹھا چکے ہیں ہم الزام پارسائی کا
وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا
ملا وہ غم کدہ، جس میں چراغ بھی نہ ملا
گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زُلفِ یار کی بُو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا
اسیر کر کے ہمیں، کیوں رہا کیا صیاد
وہ ہم صفیر بھی چھوٹے، وہ باغ بھی نہ ملا
جلال باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھول ملے ہم کو داغ بھی نہ ملا
طاقت نے سنبھالا نہ تحمل نے دمِ ہجر
سب دعویٰ ہی کرتے تھے کوئی کام نہ آیا
دم بھر کو ترے وعظ میں ہم بیٹھ کے واعظ
برسوں نہ رہے بزمِ خرافات کے قابل
غیر دشمن نہ دل رُبا دشمن
دل ہی میرا ہے بس مرا دشمن
منزل میں لے کے بیٹھ گیا ہے ہجومِ یاس
تھکتے نہ ہم تھکائے ہوئے کارواں کے ہیں
نقش قدم پکارتے ہیں راہ عشق میں
مٹ جائیں حوصلے جنہیں نام و نشاں کے ہیں
خبر کیا کس نے شیخ و برہمن میں جھگڑے ڈالے ہیں
مگر سب بزمِ رنداں میں تمہارا نام لیتے ہیں
اندازۂ طلب سے دیا بڑھ کے جب دیا
کم حوصلہ ہمیں ہیں وہاں کچھ کمی نہیں
چھٹ کر قفس سے پوچھتے ہیں ہم چمن کی راہ
غربت نصیب بھول گئے ہیں وطن کی راہ
شب کو مے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی
یار کہتا ہے چھپاؤ گے مجھے کیا دل میں
تم سے جب میری محبت ہی چھپائی نہ گئی
دے کے مٹی جو مرا حور شمائل ٹھہرے
دو گھڑی قبر میں مردہ بھی یہ مشکل ٹھہرے
گم جب سے کیے ہوش تری جلوہ گری نے
کیا کیا نہ خبردار کیا بے خبری نے
کوئی یہ پوچھ دے دردِ نہاں سے
تجھے دل ڈھونڈ لایا ہے کہاں سے
آنسو رُکے تو کیا نہیں چھپنے کا رازِ عشق
حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے
تم سلامت ہو جو دیوانہ بنانے والے
حشر تک ہوش میں عاشق نہیں آنے والے
افشاں جو چنی رات کو اُس مہ نے جبیں پر
برجوں سے تماشے کو ستارے نکل آئے
ساغر کدھر کدھر نہ جھکا چشم یار کا
دل سب کے بزمِ بادہ پرستاں میں رکھ لیے

ظہیر دہلوی (۱۸۳۵ء-۱۹۱۱ء)

بے خود ہوں تصور میں کسی برق ادا کے
سرمایۂ تسکیں ہے تڑپنا مرے دل کا
اعجاز دل فریبی انداز دیکھنا
ہر ہر ادا پہ مجھ کو گمان نظر رہا
بہت ظہیر کو ہم یاد کر کے واں روئے
کہیں جو ذکرِ حریفانِ بادہ خوار آیا

فقط اک سادگی پر شوخیوں کی ہیں گماں کیا کیا
نگاہِ شرگیں سے ہے نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا

تا چند نظر بازی و پابندیِ تقویٰ
ہمسائیگیِ شعلہ و سیماب کہاں تک

کیا بری شے ہے محبت بھی، الٰہی توبہ
جرمِ ناکردہ، خطا وار بنے بیٹھے ہیں

وہ ہیں اور غیر ہیں اور عیش کا سامان ظہیر
ہم الگ سب سے گنہگار بنے بیٹھے ہیں

دیکھتا ہوں جہاں کو اپنا سب
ایک ہو تو وفا کرے کوئی

تو کہاں آئی مرا درد بٹانے کے لیے
اے شبِ ہجر! نکل جا مرے غم خانے سے

کون ہوتا ہے مصیبت میں کسی کا دل سوز
اُٹھ گئی شمع بھی جل کر مرے کاشانے سے

کچھ یہی کوہ کن و قیس پہ گزری ہوگی
ملتی جلتی ہے کہانی مرے افسانے سے

یہ منہ سے تو کہتا ہوں چھوڑی محبت
مگر حال دل کا خدا جانتا ہے

اس مناظر نامے میں حالی کے یہ شعر پڑھیے جو اس کی دورِ اوّل کی غزلوں سے لیے گئے ہیں:

کل حالی دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ
سننے ہی کے قابل تھا تم نے بھی سنا ہوتا

بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجم میں حالی جادو بیاں نہ تھا

مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

وہ امید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

دل کش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھیے کب کارواں سے ہم

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ؟
پوچھیں گے جا کے حالی جادو بیاں سے ہم

ہے جستجو کہ خُوب سے ہے خُوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

دل پُر درد سے کچھ کام لُوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

حالی کے دوسرے دور کی غزلیات کا موڈ پہلے دور سے مختلف ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا

دل ہو کہ جان، تجھ سے کیوں کر عزیز رکھیے
دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اُٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

خود مہر وطن سے ہے وداع اب کے سفر میں
جانا ہے وہاں پھر کے جہاں سے نہیں آنا

یاروں کو ہمیں دیکھ کے عبرت نہیں ہوتی
اب واقعہ سب اپنا پڑا ہم کو سنانا

جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسہ نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا
یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

حق نے احساں میں نہ کی اور میں نے کفراں میں کمی
وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا

بن آئے گی ہرگز نہ یاں کچھ کیے بن
جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب مری جان! ہونا پڑے گا

مشکلوں کی جس کو حالی ہے خبر
مشکلیں آساں وہی فرمائے گا

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

ہے غم روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل
ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

کل یہاں کاروبار ہیں سب بند
کر لو کرنی ہے جو کمائی آج

ہم دکھا دیں گے کہ زہد اور ہے نیکی کچھ اور
کچھ بہت دور نہیں روزِ جزا اے زاہد

اس کے کوچے میں ہیں وہ بے پر و بال
اُڑتے پھرتے ہیں جو ہواؤں میں

غفلت ہے کہ گھیرے ہوئے ہے چار طرف سے
اور معرکۂ گردشِ ایام ہے درپیش

جی اُس کا کسی کام میں لگتا نہیں زنہار
ظاہر ہے کہ حالی کو کوئی کام ہے درپیش

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزمِ شعر میں
باری تب اُن کی آئی کہ گل ہو گئے چراغ

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو
ورق جب اس کا اُڑا لے گئی ہوا ایک ایک

ماں ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالیؔ نے دکاں سب سے الگ

اب سنو حالیؔ کے نوحے عمر بھر
ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

کہیں افطار کا حیلہ تو نہ ہو یہ حالیؔ
آپ اکثر رمضاں ہی میں سفر کرتے ہیں

جانور، آدمی، فرشتہ، خدا
آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں

وہ قوم جو جہاں میں کل صدر انجمن تھی
تم نے سنا بھی اس پر کیا گزری انجمن میں؟

پھر زخم پھوٹ نکلا حالیؔ نہ چھیڑنا تھا
فصل خزاں کا قصہ ذکر گل و سمن میں

لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرف آشنا
لے جائے ہم کو دیکھئے ذوق سخن کہاں

جی ڈھونڈتا ہے بزم طرب میں انہیں، مگر
وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

کبک وقمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

جی گئے ہم پہ رہے مُردوں سے بدتر حالیؔ
دیکھ لی ہم نے طبیبوں کی مسیحائی بھی

وقت تھا جو کام کا حالیؔ گنوا بیٹھے اسے
جائیے اب عمر بھر بیٹھے تاسف کیجیے

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالیؔ سے مل کے ہو گئے تم افسردہ دل بہت
اگلے سے ولولے وہ اب اس میں کہاں رہے

دورِ آخر کی غزلیات میں حالیؔ اپنی شعری پرواز کی بلندی پر نظر آتا ہے:

قطرہ اب دریا میں مل جانے کو ہے
تیری معیاد اے جدائی ہو چکی

مستی جہل میں غفلت کا نشا اور سہی
شب تاریک میں گھنگھور گھٹا اور سہی

دوستو! روگ بظاہر نہیں جانے والا
ہو چکیں ختم دوائیں تو دعا اور سہی

کم نہ تھے روگ جوانی میں بھی کچھ اے پیری
رعشہ اب اور سہی لغزش پا اور سہی

شہ کو ہے خوف عدو، خوف اجل، خوف زوال
کہہ دو اے بے خبر اک خوف خدا اور سہی

ترک دُنیا کے علائق تو کیے سب زاہد
گر مناسب ہے تو اک ترک ریا اور سہی

مدرسے میں نہ ملا کچھ تو نہ توڑ آس اے دل
اک در دولت ساقی پہ صدا اور سہی

نہ عیش خسروی رہے گا نہ صولت بہمنی رہے گی
رہے گی اے معموا تو باقی دیے کی کچھ روشنی رہے گی

مشکل ہے پاک ہونا اگر دل نہیں ہے پاک
زمزم میں غسل کیجیے کہ گنگا نہائیے

حالیؔ اور اس کے ہم عصروں کی غزل کے موضوعات، لفظیات اور اسلوب میں واضح فرق ہے جو ایک نظر میں پہچانا جاتا ہے۔ جلالؔ اور ظہیرؔ کے یہاں واعظ، شیخ وزاہد، زُلف یار، صیاد، بتوں کا عشق، بادہ پرستی، برق ادا، نگاہِ شرگیں، شب ہجر، کوہ کن وقیس کے مضامین بکثرت ہیں جو قدیم غزل کا شیوہ ہیں جب کہ حالیؔ کی غزل میں ایک صاحب دل کی بے تابی، نشاط وصل سے آگے کا بیاں، عشق بتاں سے گریز، منزل مقصود کی تڑپ، کارواں کا تصور اور قوم و ملک کے لیے درد کی باتیں موجود ہیں گویا اس کی دکاں الگ سے کھلی ہوئی نظر آتی ہے۔

اگر چہ حالیؔ کی ان کوششوں کو غزل دشمنی کے مترادف قرار دیا گیا لیکن زمانہ مابعد میں اقبالؔ کے ظہور نے حالیؔ کے کم عقل ناقدین کے اعتراضوں پر پانی پھیر دیا۔ اقبالؔ کی عہد آفریں، حکیمانہ اور فلسفیانہ فکر غزل کو کہاں سے اٹھا کر کہاں لے گئی اس کا اندازہ ان اشعار سے بخوبی ہو جاتا ہے:

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں اور زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

مجھے روکے گا 'تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

بزم ہستی اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو
'تو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبالؔ اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر، آپ ہی منزل ہوں میں

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
پھلا پھولا رہے یارب چمن میری اُمیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں
گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
آیا ہے تو جہاں میں مثال شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستی ناپائیدار دیکھ
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ
کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگذر میں نقش کفِ پائے یار دیکھ
ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبالؔ
اُڑا کے مجھ کو غبار رہِ حجاز کرے
کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں
کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے
وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے
چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے
چمن افروز ہے صیاد میری خوشنوائی تک
رہی بجلی کی بے تابی، سو میرے آشیاں تک ہے
پاس تھا ناکامیٔ صیاد کا اے ہم صفیر
ورنہ میں اور اُڑ کے آتا ایک دانے کے لیے
زائرانِ کعبہ سے اقبالؔ یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سروِ کنار جو کا
کوئی دل ایسا نظر آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے، نگار خانہ ہے آرزو کا
خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تیری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں
کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خارزار ہوگا
سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی
پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
خبر اقبالؔ کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہ دام ابھی
مل ہی جائے گی کبھی منزل لیلیٰ اقبالؔ
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر
پھر باد بہار آئی اقبالؔ غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو، گل ہے تو گلستاں ہو
اے رہرو فرزانہ، رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو
کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حُسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں
جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں
اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب! لامکاں تیرا ہے یا میرا
عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
تو ہے محیطِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بے کنار کر
باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے
کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے
عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے
نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب گل ایراں، وہی تبریز ہے ساقی
نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی
گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی
یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی
مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی
نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے، نہ قفس، نہ آشیانہ!
مرے خاک وخوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلہ شہید کیا ہے تب و تابِ جاودانہ
تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایتِ زمانہ
اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی
وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے وہ رہ و رسمِ شاہبازی
بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
تیرے بھی صنم خانے، میرے بھی صنم خانے
دونو کے صنم خاکی، دونو کے صنم فانی
درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں نہ سمرقند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند
بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یاسیں، وہی طٰہٰ
وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبریل دے تو کہوں
ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں
ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستیِ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں
سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں
تو ابھی رہگزر میں ہے قیدِ مقام سے گزر
مصر حجاز سے گزر، بادہ و جام سے گزر
جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر
تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر
حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من
قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے
کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

کب تک رہے محکومیِ انجم میں مری خاک
یا میں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے
بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لیے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے
ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی
تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب
سکھا دیے ہیں اسے شیوہ ہائے خانقہی
فقیہ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب
وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
ہر شے مسافر ہر چیز راہی
کیا چاند تارے، کیا مرغ و ماہی
تو مردِ میداں، تو میرِ لشکر
نوری حضوری تیرے سپاہی
کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی
یہ بے سوادی یہ کم نگاہی
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی
اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

چل اے میری غریبی کا تماشا دیکھنے والے
وہ محفل اُٹھ گئی جس دم، تو مجھ تک دورِ جام آیا

خزاں میں کب آ سکتا تھا میں صیاد کی زد میں
مری غماز تھی شاخِ نشیمن کی کم اوراقی

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اُس سے نہ ہو سکا، وہ تو کر

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ مُلا ہے نہ زاہد نہ حکیم

عیشِ منزل ہے غریبانِ محبت پہ حرام
سب مسافر ہیں بظاہر، نظر آتے ہیں مقیم

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

عشق تری انتہا، عشق مری انتہا
تو بھی ابھی ناتمام، میں بھی ابھی ناتمام

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسماعیلؑ

منزلِ رہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لیے
لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

میری میں فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں، جو تری نگاہ میں ہے

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد
نہ فلسفی سے نہ مُلا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و مے خانہ ہیں مدت سے خموش

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے
کہ یک زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

را بحر پرسکوں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابیِ کنارہ

تو ضمیرِ آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے
نہ بے قرار کرتا تجھے غمزۂ ستارہ

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آ گئی میسر مری شوخیِ نظارہ

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بری ہے مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی

اقبال کی شاعری کا آغاز ۱۸۹۳ء میں ہوا۔ پہلے داغ، پھر غالب اور حالی سے متاثر ہوا۔ بعد میں اپنی بلند فکری کی بدولت الگ راہ بنائی اور ۱۹۰۵ء میں داغ کی وفات کے بعد "بانگ درا" کی غزلوں جیسے قدیم مضامین سے دست کش ہوا۔ اس تبدیلی کی ایک بڑی وجہ سفرِ یورپ بھی ہے، جس کے بعد اقبال کا رُخ قومی شاعری کی طرف ہو جاتا ہے اور غزل گوئی کے موضوعات ملی ہو جاتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں عمق اور حکیمانہ بصیرت کا سبب مشرق و مغرب کے ادب پر گہری نظر ہونے کے علاوہ اپنے وقت کے استادوں سے میل ملاقات اور یورپ کا سفر ہے۔ تاہم وہ ابن عربی کی تعلیمات کا مخالف اور حافظ کی شاعری میں حرکی پہلو نہ ہونے کے سبب اس کا معترف نہ تھا۔

اقبال کا نام ان چوٹی کے شعرا میں شامل ہے

جنہوں نے قوموں کی تشکیل میں فعال کردار ادا کیا ہے۔ بل کہ اس لحاظ سے اقبالؔ کی حیثیت منفرد ہے کہ اس نے ایک آزاد ملک اور ایک آزاد قوم کا خواب دیکھنے کے ساتھ ساتھ پوری ملتِ اسلامیہ کو خطاب کیا اور اس کی اجتماعی روایات، تہذیب، عقائد اور اخلاقی اقدار کی بات کی اور دینِ فطرت کی جامعیت اور وسعت اور اس کے فلسفۂ حیات کو اُجاگر کیا۔ وہ خود بھی ایک باقاعدہ فلسفہ حیات رکھنے والا شاعر تھا جس کی مثال اُردو غزل میں اس سے پیشتر نہیں ملتی۔ اقبالؔ کی شاعری بوڑھی بیمار غزل اور تندرست نوجوان نظم کے سنگم کی شاعر ہے۔ اگر اقبالؔ نہ ہوتا تو غزل شاعری کے کارخانے میں ایک ناکارہ پرزے کی طرح پڑی رہتی۔ اقبالؔ وہ پہلا اُردو شاعری ہے جس نے غزل اور نظم کی حدوں کو آپس میں جوڑ دیا۔ اکبر الہ آبادی جیسا شاعر اس کے لیے کہتا ہے:

دعویٔ علم و خذر میں جوش تھا اکبر کو رات
ہو گیا ساکت مگر جب ذکرِ اقبال آ گیا

اقبالؔ نے مزدوروں، کسانوں کے احساسات کو آواز مہیا کی۔ محنت کش طبقے کو احساسِ محرومی سے نجات دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تہذیبی خود اعتمادی کی بحالی کے لیے جدوجہد میں مثالی کردار ادا کیا۔ نظامِ کائنات میں انسان کی اہمیت واضح کی۔ انسانی فضیلت کے جن مضامین کی جانب غالبؔ نے اشارہ کیا تھا اقبالؔ نے انہیں معراج بخشی۔ وہ حرکت کا شاعر تھا، اس تصور کا رد کہ حکیمانہ موضوعات شعریت کو مجروح کرتے ہیں۔ اس نے مردہ لفظوں میں نئی روح پھونکی اور یوں وہ معانی کا مسیحا ہے۔

اقبالؔ مظلومیٔ نسواں سے بہت غم ناک ہوتا تھا۔ وہ عورت کے حقوق اور شرعی آزادیٔ نسواں کے قائل تھے لیکن وہ آج کے ''سماجی انصاف'' کا حامی نہ تھا جس میں عورت نے مرد سے نہ صرف مقابلہ شروع کر دیا ہے بل کہ وہ مرد سے آگے نکل جانے کی متمنی نظر آنے لگی ہے۔ قرآن پاک، رسولِ اقدسؐ اور اسلام سے گہری محبت نے اقبالؔ کے پیغام میں عالمگیریت اور وسعت پیدا کی۔ اُمتِ مسلمہ کا تصور جس طرح اقبالؔ نے پیش کیا کسی اور شاعر کے ہاں موجود نہیں۔ صدیق کلیم نے اقبالؔ کے بارے میں لکھا ہے کہ ''جہاں مقصد اور مسلمانوں کا مفاد ذہن پر غالب آ جاتے ہیں شعری سطح بالعموم گر جاتی ہے۔'' شاید وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شاعری بے مقصد ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں ترقی پسند تحریک کی شاعری اور تمام مقصدی تحریروں پر اُن کی رائے کو کس شمار میں رکھنا چاہیے؟ تاہم فلسفیانہ مضامین کو شاعرانہ انداز میں بیان کرنے کا کمال غالبؔ کے بعد اقبالؔ کے حصے میں آیا ہے۔ وہ قلندرانہ ادا، سکندرانہ جلال اور حقیقت بین نگاہ رکھنے والا شاعر تھا۔

حبِ رسولؐ اقبال کی شاعری کا بنیادی سب سے منفرد اور ممتاز پہلو ہے۔ وہ عشقِ رسولؐ سے سرشار ہے اور اس کے کلام میں اس سرچشمہ رشد و ہدایت تک رسائی اور فیض یابی کے آثار و شواہد جابجا ملتے ہیں جنہیں اقبال نے کمال ادبی قرینوں سے الفاظ میں ڈھالا ہے۔ جذبۂ عشقِ رسول کی جو فراوانی اور صداقت کلامِ اقبال میں ملتی ہے اسے ودیعت کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

اقبال کی شاعری جمالیات لذت کے علاوہ بلند اخلاقی اور سیاسی مفاہیم بھی رکھتی ہے۔ اس کا زمانہ مشرق کی جہاں گیری پر مغرب کی سیاسی فتح مندیوں کا زمانہ ہے جس کے ردِعمل کے طور پر اُس میں مغربی افکار سے اصولی انحراف کی رو بیدار ہوئی اور ''ارمغانِ حجاز'' کی صورت میں سامنے آئی۔ اس کے فلسفہ حیات میں قرآن و حدیث، افلاطون وارسطو اور غزالی ورازی سے لے کر روسو اور ابنِ خلدون تک سبھی کا نچوڑ ہے۔ اُس کا عمیق ارتقائی مطالعہ ترانۂ ہندی، بلادِ اسلامیہ اور سرمایہ و محنت کی منازل سے بھی گزرا اور تابانی تہذیبِ فرنگ سے بھی متاثر ہوا لیکن مشرقی تمدن کی روح اس سارے سفر میں سرچشمہ ہدایت رہی اور حیات بخش مشرقی افکار و علوم اور شخصیات ہمیشہ اُس کے رہنمائے فکر رہی ہیں۔ اس کے سیاسی پیغام میں بھی ایسی روحانی اور اخلاقی اقدار کارفرما ہیں جو پختہ ادراکِ حقیقت پر مبنی ہیں اور شعور میں دوررس اور ہم گیر نتائج کے حامل انقلابات لانے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔ اقبالؔ نے عشق کو کائنات کا محور قرار دیا ہے جب کہ مغرب مادیت اور عقلیت پر انحصار کرتا ہے۔ اقبالؔ اور بیشتر مغربی مفکرین اور ان کے کلچر کا تضاد یہی ہے۔ اقبالؔ وسیع تر تصورِ انسانی کے لیے مساوات، اخوت اور یک جہتی کے حوالے سے ایک ایسے کامل نظامِ حیات کا خواب دیکھتا ہے جس میں مادیت کی جگہ روحانیت اور عمومی طرزِ معاشرت کی جگہ خالصتاً اسلامی طرزِ معاشرت کے لیے نرم گوشہ ہے جو اپنے باطن میں ترقی پذیر امکانات کا لامحدود اور لامتناہی سلسلہ رکھتا ہے اور زمان و مکاں کی قیود سے آزاد مگر ایک رشتۂ وحدت میں منسلک ہے یعنی توحید و رسالت وہ با مقصد مثالی انسانوں اور نصب العین آشنا مثالی معاشرہ کے لیے تڑپ رکھتا تھا جو نظامِ عالم کے ایک مرکزِ مضبوط کی بنیاد بن سکیں اور یہ مرکزی مقام عشقِ مصطفیؐ کے وسیلے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

اقبالؔ نے مصنوعی عشق کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور گریہ و نوحہ کو جوش و ولولہ سے بدل دیا۔ اقبالؔ کے ساتھ غزل میں فکر کے نئے در کھل جاتے ہیں اور غالبؔ کا فلسفہ اقبالؔ کے ہاتھوں نئی بلندیوں کو چھونے

لگتا ہے۔ اقبال نے غزل کے دل و دماغ دونوں کو روایتی موضوعات سے ہٹا کر قومی، ملی اور اصلاحی موضوعات کو اس میں سمویا لیکن وہ درسِ اخلاق دیتے ہوئے بھی واعظانہ رنگ اختیار نہیں کرتا۔ اس کی شاعری تین ستونوں پر کھڑی ہے۔ خودی، عشق اور عقل۔ خودی سے وہ سعی پیہم کا پیغام دیتا ہے جسے عشق استحکام بخشتا ہے اور عقل رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ اقبال کی غزل نے اس صنف میں فکری کم مائیگی کی تہمت کا اتار پھینکا اور جدوجہد کے راستے کو خانقاہی قلندری پر ترجیح دی اور غزل کا محبوب ہی بدل دیا یعنی یہ شخصیت نہ رہا بلکہ قوم اور ملت کا روپ دھار گیا۔

اقبال کی فنی و فکری عظمت یہ ہے کہ اس نے فلسفیانہ موضوعات میں ایسی درد بھری لے بھری کہ شعر میں جذبے کی رعنائی بھی قائم رہی اور فکر نے جذبے کا دامن بھی نہ چھوڑا۔ اقبال کی مربوط سوچ نے فکر، فلسفہ اور شاعری کا ایک نظام وضع کیا جو اردو شاعری میں کہیں اور نظر نہیں آتا۔ مجھے تو اقبال کے تدریجی ارتقا نے ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے کہ ''بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا'' جیسے مصرعے بنانے یا بنوانے والا شاعر کیسے اردو غزل کا رخ موڑ کر اپنی طرف لے گیا۔ (مصرعے بنوانے کے الفاظ میں نے داغ کی شاگردی کے حوالے سے لکھے ہیں) مجھے یقین ہے داغ نے اقبال کو اپنی شاگردی سے اس لیے فارغ التحصیل نہیں کیا ہوگا کہ وہ تکنیکی طور پر پختگی کی منزل پر آ گیا ہوگا بلکہ میرے خیال میں اس کے علاوہ اقبال کی غزل میں کروٹ لیتے ہوئے فکری نظام، اس کی تشبیہوں اور استعارات کے جدا جہانِ معنی نے داغ کو مجبور کیا ہوگا کہ وہ اس طائر لاہوتی کو اپنی پرواز پر جانے دے اور ''عاشق کو تاڑنے'' تک محدود کر کے اس کی اختراعی صلاحیتوں کے گرد پنجرہ نہ بنائے رکھے۔ تاہم اقبال ۱۹۰۸ء تک کسی نہ کسی طرح داغ کے حلقۂ اثر سے باہر نکلنے کی کوشش میں رہا۔ اگرچہ اقبال کو شاعر ہونے سے زیادہ اپنے مفکر ہونے کا احساس رہا لیکن ملتِ اسلامیہ کو قد آور مفکر تو اور بھی میسر آئے لیکن ایسا قد آور مفکر شاعر اردو کو اقبال کے بعد میسر نہ آ سکا۔ اقبال اچھے شعر کی آمد کو مصلوب ہونے کی کیفیت کے مترادف قرار دیتا ہے (مولانا گرامی کے نام ایک خط میں اظہار) اور واقعتاً یہ بات اقبال پر صادق بھی آتی ہے کہ اس نے مردہ الفاظ میں نئی روح ڈال دی۔ نئی ترکیبیں اختراع کیں اور محاسن شاعری کا ایسا فطری استعمال کیا کہ ان پر شعوری طور پر برتے جانے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ الفاظ، موضوع اور اظہار ایسے گھل مل گئے جیسے اقبال کے لیے ہی بنے تھے۔ جہاں سرگوشی کو موقع ہے وہاں سرگوشی ہے اور جہاں بلند آہنگی درکار ہے وہاں بلند آہنگی ہے پھر بھی شکوہ مضمون ایک جیسا ہے۔

اقبال کے بعد اس کے قریبی ہم عصروں میں مولانا حسرت موہانی، فانی بدایونی، مولانا محمد علی جوہر اور منشی محمد الدین فوق وغیرہ کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ منشی محمد الدین فوق (۱۸۷۷ء) نے شعر و ادب میں اور ملی مسائل کو موضوع بنایا، تصوف سے بھی شغف رہا۔ کشمیر کے حوالے سے اتحاد عالم اسلامی اس کا خاص موضوع رہا۔ کلیم اختر نے لکھا ہے کہ ''فوق صاحب پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مستقل طور پر مسلمانانِ کشمیر کی ترجمانی کرتے ہوئے اہل عالم کو ان کی غلامی سے روشناس کرایا۔'' ''فوق اخبار نویس بھی تھا اور ایک بیدار مغز اور مستقل مزاج شخص کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ تین جلدوں میں تاریخ کشمیر اس کا کارنامہ ہے۔'' 'کشمیری میگزین' عرصہ تیس برس تک اس کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ کشمیری عوام کے احساسات کو آواز مہیا کرنے میں اس کا بڑا کردار ہے۔ اس کی اس مساعی کو فکرِ اقبال سے منسلک کیا جاسکتا ہے۔

سن تو لو نالے دلِ ناکام کے
بیٹھ جاؤ گے کلیجہ تھام کے
کس ہستی موہوم پہ غافل یہ تکبر
اتنا تو سمجھ کوئی رہے گا نہ رہا ہے

مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء) برطانوی ملوکیت کا بے باک نکتہ چیں تھا۔ ایسا زبردست انشا پرداز تھا کہ اس میں چھپنے والے مقالات پڑھ کر ایچ جی ویلز کو کہنا پڑا کہ ''محمد علی نے برک کی زبان، مکالے کا قلم اور نپولین کا دل پایا ہے۔'' سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں قید بھی کاٹی لیکن جوشِ آزادی کم نہ ہوا۔ تحریک ترکِ موالات اور تحریک خلافت کی روح و رواں رہا۔ جامعہ ملیہ دہلی کی بنیاد رکھی۔ کانگریس کا سرگرم رکن رہا اور تحریک عدم تعاون میں جیل کاٹی۔ نہرو رپورٹ کے بعد کانگریس سے علیحدگی اختیار کی اور مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ اس کی فکر میں بھی اقبال سے ہم آہنگی کے اجزا موجود ہیں۔

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے و لے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
ہے رشک کیوں یہ ہم کو سردار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
جنس گراں تو تھی نہیں کوئی مگر یہ جاں
لائے ہیں ہم بھی گرمیِ بازار دیکھ کر

بے خوف غیر دل کی اگر ترجماں نہ ہو
بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زباں نہ ہو

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

خوفِ غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر
ہیں جہان اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

دے نقدِ جاں تو بادۂ کوثر ابھی ملے
ساقی کو کیا پڑی ہے کہ یہ مے ادھار دے

عشق تو اپنا خود انجام ہے پر تو ناصح
اور اک مسئلہ سود و زیاں لایا ہے

ان اشعار میں آپ کو اقبال کی شاعری سے بالواسطہ تعلق کی جھلک ضرور ملے گی۔

حکیم سعید احمد ناطق لکھنوی (۱۸۷۸ء) ناطق کے اسلوب میں لکھنوی نزاکت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اگرچہ ناطق کو ہم فکرِ اقبال کے تسلسل کا شاعر نہیں کہہ سکتے لیکن ڈھونڈنے سے اس کی غزل میں بھی دو ایک اشعار ایسے مل جاتے ہیں جن پر اقبال کے سائے نظر آتے ہیں جیسے:

محبت آشنا دل مذہب و ملت کو کیا جانے
ہوئی روشن جہاں بھی شمع پروانہ وہیں آیا

دو عالم سے گزر کر بھی دلِ عاشق ہے آوارہ
ابھی تک یہ مسافر اپنی منزل پر نہیں آیا

حیات کو بھی اگر عذر ہے خدا حافظ
مگر مجھے تو پہنچنا ہے اپنی منزل تک

تاہم اس کا یہ شعر تو اُردو شاعری میں تادیر محفوظ رہے گا۔

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

حسرت موہانی (۱۸۷۸ء) وہ اپنے زمانے کا بہت مقبول شاعر تھا اور رئیس المتغزلین کہلاتا تھا۔ وہ کلاسیکی غزل کا آخری ستارہ ہے جس نے روایتی غزل کو دم توڑتی ہوئی کیفیت سے باہر لا کر ایک بار پھر زندگی کے قریب کیا۔ تاہم اس کی غزل میں خطوطِ غالب کی طرح بے تکلف گفتگو والی انفرادیت ہے۔ تغزل ہے لیکن تصوراتی نہیں بل کہ حیاتی تجربے جذبے میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ وہ بے حد حساس اور رجائیت پسند تھا۔ اس نے ہوس پرستی کی روایت پر اکتفا نہیں کیا بل کہ اس کے کلام میں آسودگیٔ عشق ہے، عشق کی نفسیاتی تجلیاں ہیں اور عشقِ مجازی کی گوناگوں کیفیات، لطافتِ بیان، رنگینیٔ شوق، جوشِ بیان، طلسمِ خیالات، تخیل کی رفعت اور جذبات میں خلوص کے سبب وہ بیسویں صدی کی غزل کا نہایت اہم شاعر ہے۔ ایسی ایسی تصویریں کھینچتا ہے کہ مثال ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی غزل میں آنے والی کل کے لیے ایک اُمید ملتی ہے جو اس کی ٹوٹ پھوٹ میں بڑا مثبت رویہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے امکانات سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔ وہ ایک نظریاتی شخص تھا لیکن غزل میں نظریات کی بجائے جذباتی حقیقت نگاری کو ترجیح دی۔ حسرت کی زندگی میں ایک جگہ ٹھہر کر تجربے کو گہرائی سے ہمکنار کرنے کی نسبت ولولۂ عمل کے تحت آگے بڑھ جانے کا رویہ موجود ہے جو اُسے زندگی، اُمید اور حوصلے سے جڑا ہوا شخص ظاہر کرتا ہے۔ وہ انقلابی خیالات کا سیاسی آدمی تھا، مکمل آزادی پر یقین رکھنے والا۔ سیاست سے حسرت جیسی وابستگی اور قول و فعل کی ہم آہنگی شاید ہی کہیں دیکھنے کو ملتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حسرت کے سیاسی اشعار میں بھی اس کی شائستہ شخصیت کا رنگ نظر آتا ہے۔ حسرت نے اگرچہ تصوف اور روحانیت کی فضا میں آنکھ کھولی لیکن اس کے اثرات اس کی شاعری پر زیادہ نظر نہیں آتے بلکہ حسن و عشق کی زنجیر نے اس کو مابعد الطبیعاتی منزلوں کی طرف بڑھنے سے روکے رکھا۔ حسرت کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے غزل کو کوچۂ تصنع سے نکالا، ماضی کی تلمیحات سے کنارہ کشی کا وصف سکھایا اور دربار سرکاری کی خدمت میں حاضری سے نجات دلائی۔ غزل کو نکھار کر پختہ اور رچی ہوئی روایت کے دھارے پر ڈالا اور آنے والے شعراء کے لیے نفاست، شائستگی اور سربلندی کے نئے رستوں کا تعین کیا۔ کسی فکری، فلسفیانہ یا نظریاتی دبستان سے وابستگی کے بغیر اپنی افتادِ طبع کے سہارے سیدھی سادی جذبے والی شاعری کی۔ حسرت موہانی جیسے شاعر پر بھی اقبال کے اثرات پائے جاتے ہیں جیسے:

جان کو محوِ غم بنا دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطعِ رہِ مراد کر

خرمیٔ دو روزہ کو عشرتِ جاوداں نہ جان
فکرِ معاش سے گزر حوصلۂ معاد کر

قول کو زید و عمرو کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر

وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

فانی بدایونی (۱۸۷۹ء) وہ بلاشبہ ایک ذہین، منفرد اور قابل شاعر تھا۔ بڑی بات کو نہایت سادگی لیکن پرکاری اور نزاکت سے بیان کر دیتا تھا۔ اس کے یہاں غالب کی سی سنجیدگی اور حکیمانہ بالغ نظری اور میر کی سی حزن و یاس کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ اوّلین شاعری میں ناسخ اور داغ کے اثرات ہیں جب کہ بعد میں میر، غالب اور مومن سے مرعوب نظر آتا ہے۔ اپنے ہم عصروں حسرت، یاس، اصغر اور جگر سے اپنے غم انگیز طرزِ بیان کی بنیاد پر مختلف ہے جس میں

لذتِ درد کے ساتھ ساتھ انا اور خودداری کی کہانی موجود ہے۔ اس کی غزل کا مرکزی نقطہ ہی فلسفۂ غم ہے۔ فانی نے غم کا نیا مزاج دیا اور اسے نئے آداب سکھائے۔ اس کی غزل ایک غم رسیدہ، بے زار اور بے دل شخص کی غزل لگتی ہے جس میں میر کا سوز و گداز، غالب کی مفکرانہ بالغ نظری اور داغ کے رنگ کی زبان کی نزاکتیں بھی شامل ہیں۔ اس کے ہاں منفرد استفہامی اشعار کی موجودگی اس بات کا اشارہ ہے کہ اس کا باطن سوالات سے پُر تھا۔ فانی کی زندگی ابتداء آرام و سکون سے گزری مگر باقی عمر مالی زبوں حالی کا شکار رہی۔ اس کی شاعری میں حزن و یاس کی ترجمانی کے ساتھ جو تصوف کا مس نظر آتا ہے اس میں مذہبی روایات کے علاوہ اسی خراب حالی کا بھی کچھ نہ کچھ دخل رہا ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ فانی کی شاعری اور زندگی میں فرق بہت کم نظر آتا ہے اور یہ فرق وہاں زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے جہاں فانی حقیقت کی بجائے مجاز کا رخ کرتا ہے۔ فانی نے دکھے ہوئے دل سے شاعری کی۔ وہ اپنی شاعری میں پیکرِ غم دکھائی دیتا ہے لیکن اس کی غزل محض افسردگی کا شکار نہیں۔ زندگی کے آلام کے نتیجے میں اس کے ہاں جو داخلیت آئی فانی نے اسی سے اپنی بصیرت کو چمکایا۔ موضوعات کی کمی نے فانی کو بڑے شعراء کی فہرست میں جانے سے روک دیا ہے لیکن وہ اہم شعراء کی فہرست میں شامل رہے گا۔ اس کے چند اشعار پر بھی اقبالؔ کی طرز کا گمان گزرتا ہے۔

بے واسطۂ خود نگری اپنی طرف دیکھ
آئینہ اُٹھا حُسنِ خود آرا سے گزر جا
ذرّے میں ہے گم وسعتِ صد عالمِ صحرا
ذرّے کو سمجھ وسعتِ صحرا سے گزر جا
یوں سب کو بھلا دے کہ تجھے کوئی نہ بھولے
دُنیا ہی میں رہتا ہے تو دنیا سے گزر جا
بھر لے نگہ آخرِ بے رنگ میں ہر رنگ
دنیا کو بھی لیتا ہوا دُنیا سے گزر جا
کثرت میں دیکھتا جو تکرارِ حسنِ وحدت
مجبورِ یک نظر آ، مختارِ صد نظر جا

اس کے بعض اشعار لاجواب ہیں:

آتے ہیں عیادت کو تو کرتے ہیں نصیحت
احباب سے غم خوار ہوا بھی نہیں جاتا
مجاز اور حقیقت کچھ اور ہے یعنی
تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا
مرے شوق نے سکھایا اُسے شیوۂ تغافل
نہ مجھے نیاز ہوتا نہ وہ بے نیاز ہوتا
سکونِ خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار
نہ موجِ بوئے گل اُٹھتی نہ آشیاں ہوتا
کیوں جنوں پھر نہ بیاباں میں بہار آئی ہو
بڑھ چلا ہے مرے دامن سے گریباں میرا
میں نزع میں ہوں عہدِ وفا کا محل نہیں
وعدہ نہ کر کہ وقت نہیں اعتبار کا
فانی دوائے دردِ جگر زہر تو نہیں
کیوں ہاتھ کانپتا ہے مرے چارہ ساز کا
اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا
تری ترچھی نظر کا تیر ہے مشکل سے نکلے گا
دل اس کے ساتھ نکلے گا اگر یہ دل سے نکلے گا
شوقِ بے تاب کا انجام تحیر پایا
دل سمجھتے تھے جسے دیدۂ حیراں نکلا
مری حیات ہے محروم مدعائے حیات
وہ رہ گزر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا
نشانِ مہر ہے ہر ذرہ ظرفِ مہر نہیں
خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا
بجلیوں سے غربت میں کچھ بھرم تو باقی ہے
جل گیا مکاں یعنی کوئی تھا مکاں اپنا
میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا
فانی طلسمِ رازِ حقیقت ہی ہے کہ ہے
تجھ پہ تری نگاہ کا پردا پڑا ہوا
ہائے کیا دن ہیں کہ نقشِ سجدہ ہے اور سر نہیں
یاد ہیں وہ دن کہ سر تھا اور وبالِ دوش تھا
شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں
آنکھ کھلی تو دنیا تھی، بند ہوئی افسانہ تھا
عہدِ جوانی ختم ہوا اب مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
ہم بھی جیتے تھے جب تک مر جانے کا زمانہ تھا
اب تک تری گلی میں یہ رُسوائیاں نہ تھیں
اب تک تو اس زمیں پہ کوئی آسماں نہ تھا
حالِ دل کس اُمید پہ کہیے
جب تمہیں اعتبار ہی نہ رہا
درد کو پھر ہے مرے دل کی تلاش
خانہ برباد کو گھر یاد آیا
اُس کو بھولے تو ہوئے ہو فانی
کیا کرو گے وہ اگر یاد آیا
یہ کوچۂ قاتل ہے آباد ہی رہتا ہے
اک خاک نشیں اُٹھا اک خاک نشیں آیا
دُنیا کے گلے شکوے ہم حشر میں کیا کرتے
کہنا تو بہت چاہا کچھ یاد نہیں آیا
فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

آزاد کچھ ہوئے ہیں اسیرانِ زندگی
یعنی جمالِ یار کا صدقہ اُتر گیا

وعدے کی رات گردشِ افلاک رُک گئی
جب تم سے بن گئی تو زمانہ بگڑ گیا

لنگر کا آسرا ہے نہ تائید ناخدا
میرے سپرد ہے مری کشتی خدا کے بعد

شاید میں درخورِ نگہ کرم بھی نہیں
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور

فانی صبا نے حقِ محبت نبھا دیا
پہنچا دیا غبار مرا کوئے یار تک

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

کوئی وجہ تسکیں نہیں، غم نہ راحت
خدا جانے فانی میں کیا چاہتا ہوں

میری نظروں میں تو بے واسطۂ دید ہے تو
میں بہ عنوانِ تجلی بھی تجھے یاد نہیں

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

وحشتِ دل اب وہ اگلا سا ستانا چھوڑ دے
خاک اُڑائی جس میں برسوں اب وہ صحرا ہی نہیں

ارماں جو یوں نہیں تو نکلتے ہیں کس طرح
یعنی ہمارے دل سے نکالے ہوئے تو ہیں

جزو ہم یقین وہیں یقیں اس منزل آب وگل میں نہیں
یہ عالم دل ہے یعنی وہ آنکھوں میں نہیں جو دل میں نہیں

ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانی
ہم نہ ہوں گے وہ دن بھی دور نہیں

جاری ہے دردِ دل مری رگ رگ میں چارہ ساز
کیا پوچھتا ہے درد کہاں ہے کہاں نہیں

وہ اُدھر رُخ اِدھر ہے میت کا
لوگ فانی کو قبلہ رو تو کریں

کیسی بہار اب وہ خزاں کے بھی دن گئے
اب ہم کہیں ہیں، دام کہیں، آشیاں کہیں

مسکرائے وہ حالِ دل سُن کر
اور گویا جواب تھا ہی نہیں

اے بے خودی ٹھہر کہ بہت دن گزر گئے
مجھ کو خیالِ یار کہیں ڈھونڈتا نہ ہو

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

دل کی طرف حجابِ تکلف اُٹھا کے دیکھ
آئینہ دیکھ اور ذرا مسکرا کے دیکھ

ہر زندگی کا نام نہ رکھ دل کی زندگی
ایمان زندگی پہ نہ لا، آزما کے دیکھ

یہاں بلائے شبِ غم وہاں بہارِ شباب
کسی کی رات کسی کے ہیں دن قیامت کے

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

حرم میں آ ہی نکلے ہیں تو فانی
یہ کیا کہیے کہ نیت تھی کہاں کی

فصلِ گل خیر تو ہے دشت میں دیوانوں کی
دامنوں کی خبر آئی نہ گریبانوں کی

اب جفا ہے نہ وفا، یاد وفا باقی ہے
تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانوں کی

نہ سانس کا ہے بھروسا نہ آہ میں تاثیر
وہ کیا پھرے کہ ہوا پھر گئی زمانے کی

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی
منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

وہ نظر، کامیاب ہو کے رہی
دل کی بستی خراب ہو کے رہی

کچھ کہہ کے چارہ ساز نے تسکین دی تو ہے
سنتا تو ہوں کہ اب مری حالت سنبھل گئی

حشر کا دن بھی ڈھل گیا فانی
دل کی رُوداد مختصر نہ ہوئی

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر
نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

زندگی بے دلوں پہ تہمت تھی
مر نہ جاتے اگر جیے ہوتے

فرصت ہی نہیں کوئی گھڑی رنج سے غم سے
سو کام لگے ہیں دلِ ناکام کے دم سے

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات
مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

دل کا اُجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسانا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے

نگاہِ ناز و سوزِ عشق دونوں ایک ہیں لیکن
کہیں ہوتی ہے یہ بجلی کہیں معلوم ہوتی ہے

نہیں معلوم راہِ عشق میں ہے بھی کوئی منزل
جہاں تھک کر نظر ٹھہرے وہیں معلوم ہوتی ہے

کیا کہوں جی رہا ہوں کیوں فانی
مقتضا حکمتِ الٰہی ہے

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے
تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

اُٹھ گئے دنیا سے فانی اہلِ ذوق
ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے

صنفِ نازک کون؟

ڈاکٹر انور محمود خالد

نہ جانے کس ستم ظریف نے سب سے پہلے عورت کو "صنفِ نازک" اور مرد کو "صنفِ کرخت" یا "صنفِ قوی" قرار دیا؟ یقیناً وہ ہومر، ملٹن یا معرّی کی طرح کا کوئی نابینا شاعر ہوگا۔ یہ شاعروں کی مخلوق ہی ہے جنھوں نے ع وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ...... کہہ کر حسین عورت کا مقام و مرتبہ، بے چارے مرد سے بڑھا دیا ہے اور اسے نرم و نازک تتلی، حور، پری، اپسرا، دیوی اور وینس قرار دیتے ہوئے دل کے تختِ طاؤس راج سنگھاسن پر لا بٹھایا ہے۔ دنیا کی پوری عشقیہ شاعری دیکھ جایئے! ننانوے فیصد شاعر عورت کی نزاکت و لطافت اور حسن و جمال کے قصیدے پڑھتے نظر آئیں گے اور سیفو، میرا بائی اور فروغ فرخ زاد جیسی شاعرات کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جنھوں نے مردوں کی (اور وہ بھی محدود) مدح سرائی کی ہو...... انھوں نے بھی مرد کی بالادستی تسلیم کرنے میں خاصے بخل سے کام لیا ہے۔ کوئی شاعرہ اپنی ہی ہم جنسوں کی تعریف میں رطب اللسان ہے اور کوئی دھرم کی کسی مقدس شخصیت کی پجارن (ع اے ری، میں تو پریم دیوانی، مرا درد نہ جانے کو) اور کوئی اپنی شاعری کے آئینے میں اپنا ہی عکس دیکھ دیکھ کر اس پر فدا ہے۔ مرد اپنے آپ کو بلاوجہ عورتوں پر حاوی سمجھ کر خود فریبی میں مبتلا ہیں اور یہ احمق، یہ سوچ کر خوش ہوتے ہیں کہ وہ "قوّامون علی النسا" ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے عورت اپنی ہر حیثیت میں، خود کو بظاہر کمزور اور مکمل طور پر دوسروں کے رحم و کرم پر ہونے کا تاثر دیتے ہوئے، اپنی اصل اوقات سے بڑھ کر اپنا حصہ وصول کرتی ہے۔ بے شک عورت ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے، بیوی ہے...... اور یقیناً وہ ہر روپ میں محبوبہ ہے۔ مثلاً عورت کی سب سے عظیم صورت ماں ہے۔ جس کے قدموں تلے جنت ہے۔ باپ کے قدموں تلے کیا ہے؟ یہ آپ جانیں یا آپ کا خدا جانے! بہن، اپنے بھائی کو "ویر" کہہ کر اس کی محبت سمیٹتی ہے، جس کی شادی پر وہ "ویر میرا گھوڑی چڑھیا"...... جیسے گیت گاتی ہے اور جس میں وہ اسے "دیسوں کا راجہ" اور "امبڑی کے دل کا سہارا" جیسے خوش کن خطاب دے کر اپنا فطری حق مانگتی ہے۔ بیٹی کی حیثیت سے وہ "لاڈو" اور "دھی رانی" بن کر اپنی ہر جائز، ناجائز خواہش منواتی ہے اور بے چارے والدین یہ سوچ کر کہ وہ پرایا دھن ہے اور میکے میں کچھ عرصہ کے لیے مہمان ہے، دل و جان سے اس پر فدا ہوتے ہیں اور اس کا کہا نہیں ٹالتے۔ رہی بیوی تو اس کے ناز نخروں کے کیا کہنے! شادی ہوتے ہی وہ سسرال میں خود کو ملکہ سمجھنا شروع کر دیتی ہے اور گھر کے افراد کو اپنے نوکر چاکر، خدمت گزار، باندی اور غلام۔ شوہر بے چارہ قسمت کا مارا، ماں باپ، بہن بھائی، سب کو بھول کر دست بستہ ہر وقت اس کے سامنے کھڑا رہتا ہے اور اس کی ہر فرمائش پر، نظریں نیچی کیے، سر جھکائے عرض کرتا ہے کہ "جو حکم سرکار!" اس سارے منظر نامہ میں وہ مخلوق کہاں ہے جسے "صنفِ کرخت" یا صنفِ قوی یا مردانہ صفات کا حامل "ہرکولیس" کہا جاتا ہے؟

روایت ہے کہ عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اور شاید اسی لیے اسے ٹیڑھی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی تلقین کی جاتی ہے کہ اس پسلی کو سیدھا کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، ورنہ وہ ٹوٹ جائے گی۔ یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ آدم کو شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کی ترغیب، شیطان کے بہکاوے پر حوا نے دی تھی۔ لہٰذا آدم کے پہلے گناہ کی محرک، عورت ہے۔ حالانکہ آدم اور حوا، دونوں بیک وقت پیدا کیے گئے اور شیطان نے دونوں کو بیک وقت حکمِ خداوندی کی نافرمانی پر اکسایا۔ یوں خدا کی نگاہ میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نہ کوئی فریب کار ہے اور نہ کوئی فریب خوردہ۔ دونوں سے لغزش ہوئی اور دونوں کو خدا نے معاف کیا۔ نہ کوئی قوی ہے نہ کوئی ضعیف۔ نہ نازک ہے، نہ کرخت۔ البتہ یہ عورت کی دانائی ہے کہ اس نے مرد کو حاکم اور خود کو محکوم، مرد کو ظالم اور خود کو مظلوم، مرد کو بالادست اور خود کو زیردست ظاہر کرتے ہوئے مرد کو بے وقوف بنا کر اس کے جسم و جاں کو جیت لیا۔

عام طور پر دنیا کو پدری معاشرہ کہا جاتا ہے اور اسی بنا پر مرد کو عورت پر فوقیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ابتدا میں یہ مادری معاشرہ تھا۔ اسی لیے وطن کو "مادرِ وطن" کہا جاتا ہے۔ سوائے جرمن قوم کے جو اپنے ملک کو "پدرِ وطن" (Fahter Land) کہتی ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں کہیں قوم یا قبیلہ کو مرد کے نام سے اور کہیں عورت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دراصل ابتدا میں، جنگل کا معاشرہ تھا اور انسان نے کام کی تقسیم کر لی تھی۔ مرد گھر سے باہر شکار کے لیے جاتا تھا اور عورت گھر بار سنبھالتی تھی۔ بچے زیادہ وقت ماں کے ساتھ گزارتے تھے، اسی لیے اس سے زیادہ مانوس اور بے تکلف ہوتے تھے۔ باپ کا زیادہ وقت

گھر سے باہر کتنا تھا، اسی لیے وہ بچوں سے کم بے تکلف ہوتا تھا اور وہ اس سے ڈرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بچے قابو میں نہیں آتے تھے تو مائیں انہیں باپ سے پٹوانے کا خوف دلاتی تھیں اور بچے ڈر کے مارے شرارتوں اور شوخیوں سے باز آ جاتے تھے۔ اس رویے نے مرد کے رعب کو جنم دیا اور وہ جسمانی اور ذہنی طور پر بالادست مانا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ جب انسان جنگل سے باہر نکلا، تمدنی زندگی سے آشنا ہوا تو اس کی پدری حیثیت مزید مستحکم ہوئی اور یوں معاشرہ مادری نظام سے پدری نظام کی طرف منتقل ہوا اور مرد کو ''صنفِ قوی'' اور عورت کو ''صنفِ ضعیف'' قرار دے کر نہ صرف طبقاتی تقسیم کی بنیاد رکھی گئی بلکہ تقسیم کار کو بھی ایک مسلمہ اصول کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ مرد کا فریضہ روزی کمانا اور عورت کا فریضہ روزی خرچ کرنا سمجھا گیا۔ مرد گھر کے باہر کام کرتا تھا اور عورت گھر کے اندر کام کرتی تھی۔ کھانا پکاتی اور بچے پالتی تھی۔ وہ گھر کی رانی تھی اور مرد باہر کا راجہ۔ یوں معاشرے کے اندر ایک توازن، اعتدال اور ہم آہنگی کی فضا تھی۔

جوں جوں تہذیب و تمدن نے ترقی کی، مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے شعور نے بھی ترقی کی منازل طے کیں۔ تعلیم عام ہوئی تو عورتیں بھی اس سے بہرہ ور ہوئیں اور وہ سوچنے لگیں کہ جو کام مرد کر سکتے ہیں، وہ ہم کیوں نہیں کر سکتیں۔ یوں مسابقت کی فضا میں شعورِ نسواں، تعلیمِ نسواں، حقوقِ نسواں اور آزادیٔ نسواں کے نعروں نے جنم لیا۔ اب عورت نہ صرف مرد کا مقابلہ کرنے بلکہ زندگی کی دوڑ میں اس سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ پہلے اس کے ذمے گھر، بچوں اور شوہر کی دیکھ بھال تھی۔ اب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کر اس نے اُن بنیادی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ روزی کمانے کی اضافی ذمے داری کو بھی اپنے اُوپر لاد لیا ہے اور یوں چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پسنے لگی ہے۔ اب وہ خود کو ''صنفِ ضعیف'' نہیں ''صنفِ برتر'' (Better Half) سمجھنے لگی ہے۔ کیونکہ وہ دوہری ذمے داریاں نبھا رہی ہے اور اپنی اس نئی حیثیت و اہمیت پر نازاں ہے۔ وہ دن اب دور نہیں جب واقعی عورتیں خود کو ''قوامون علی الرجال'' سمجھنے لگیں گی اور ''صنفِ نازک'' کی اصطلاح کو اپنے اوپر ایک طنز سمجھتے ہوئے اس لغت سے نکالنے پر اصرار کریں گی۔ تنگ چڑھے مردوں کو اپنی نئی حیثیت قبول کرنے کے لیے ابھی سے تیاری شروع کر دی چاہیے۔

ع ہم نیک و بد، حضور کو سمجھائے دیتے ہیں!

(بشکریہ ریڈیو پاکستان فیصل آباد)

غزلیں

اے یادِ یار اجازت چاہتی ہوں
کوئی تازہ محبت چاہتی ہوں
نپٹتے ہی نہیں ہیں کام گھر کے
ذرا سی دیر فرصت چاہتی ہوں
نہیں بھاتی یہ خال و خد کی زردی
گلابوں جیسی رنگت چاہتی ہوں
ہوائے وصل تھوڑی دیر ٹھہرے
بس اتنی سی رعایت چاہتی ہوں
اے کوزہ گر ادھر ہے خاک میری
میں ہونے کی عنایت چاہتی ہوں
میں تنہائی سے عاجز آ گئی ہوں
صداؤں کی میں وحشت چاہتی ہوں
یہ بستی گونگے بہروں کی ہے لبنیٰ
میں نغموں کی سماعت چاہتی ہوں

....

چشمِ نمناک پہ رکھ دیتا تھا
آگ کو خاک پہ رکھ دیتا تھا
کوئی چہرہ تو مجھے مل جاتا
تو نے بس چاک پہ رکھ دیتا تھا
کوئی تو جگنو، کوئی تارا ہی
میری پوشاک پہ رکھ دیتا تھا
اپنے پیروں میں جگہ دیتی تھی
مجھ کو افلاک پہ رکھ دیتا تھا
حیرتِ آنکھ کا لمحہ کوئی
حدِ ادراک پہ رکھ دیتا تھا

لبنیٰ صفدر/ لاہور

فروغِ ادب کے لیے وقف

بہ یاد: سید قاسم محمود

بُک ڈائجسٹ

bookdigest@hotmail.com

ISSN 2079-4584

مدیرِ اعلا: مظہر سلیم مجوکہ

mazharmajoka@yahoo.com

مدیرِ اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ

azharmajoka@yahoo.com

برائے خط و کتابت/ ترسیلِ زر

بُک ڈائجسٹ

کتاب ورثہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ 0333-4377794

اردو کے پھیلتے عالمی دائرے

ڈاکٹر مختار عزمی

قومی سطح پر اردو کی دکھ بھری داستان ہمیں رلاتی ہے تو غیروں کو ہنساتی ہے۔ گزشتہ دنوں [1] برطانیہ کے نامور ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز [2] David Mathews پاکستان آئے تو تعجب کا اظہار کیا کہ ابھی تک اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان کیوں نہیں بنایا جاسکا۔ اس موقع پر ڈاکٹر طاش مرزا [3] نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''یوم آزادی کے موقع پر تاشقند کے پاکستانی سفارتخانے میں نہ صرف سفیر محترم نے انگریزی میں اظہار خیال کیا بلکہ صدر پاکستان اور وزیراعظم کے پیغامات بھی انگریزی میں لکھے اور پڑھے گئے۔''

صد افسوس جسے ہم ''قومی زبان'' کہتے نہیں تھکتے جب اسے سرکاری سطح پر نافذ کرنے کا وقت اور مطالبہ آتا ہے تو منافقت کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین کی ایک ایک شق پر کئی کئی دن تک بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ اسی متفقہ آئین کی دفعہ 251 میں واضح طور پر لکھا ہے کہ 1988ء تک اردو سرکاری طور پر نافذ کردی جائے گی...... تو پھر کون ہے جس نے حکومتوں کا ہاتھ روک رکھا ہے؟ 1988ء کے بعد تقریباً پانچ مرکزی حکومتیں اردو میں عوام سے ووٹ مانگ کر برسرِ اقتدار آئیں اور بے وفائی سے اردو کو پس پشت ڈالتی چلی گئیں۔ پی پی پی کی حکومت کے جاتے ہی عبوری حکومت نے 2012ء میں ایک اور مواد کیا کہ مقتدرہ قومی زبان کا دائرہ کار محدود کرکے اسے ''ادارہ فروغ قومی زبان'' میں بدل دیا گیا۔

اس بند گھر میں کیا کہوں کیسا طلسم ہے
کھولے تھے جتنے قفل، وہ ہونٹوں پہ پڑ گئے

اس کے علی الرغم صورتحال یہ ہے کہ اردو اپنی قوتِ نمو اور عوام و خواص میں پذیرائی کی بدولت دنیا کی دوسری بڑی زبان بن چکی ہے۔ اس کا ایک مظاہرہ مجھے اس وقت دیکھنے کو ملا جب جنوری 2015 میں عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ الحمدللہ اس سے قبل 1999، 2004 اور 2009 میں بھی یہ سعادت مل چکی ہے مگر اس بار راقم نے اردو کی پذیرائی اور پھیلاؤ کے کئی دلچسپ نظارے دیکھے اور حیران بھی ہوا۔ حرمین شریفین، عالم اسلام کے دو اہم عالمی مراکز ہیں، وہاں عربی کے بعد اردو تیزی کے ساتھ رابطے کی زبان بنتی جارہی ہے اور یہ وہ دائرہ ہے جو برصغیر سے باہر تشکیل پا رہا ہے۔

اردو کے آغاز وارتقاء کے حوالے سے سارے نظریہ ساز اس نکتے پر متفق ہیں کہ دو یا دو سے زیادہ گروہوں کے زیادہ سے زیادہ عرصہ تک ملاپ کے نتیجے میں کسی نئی زبان کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی ہوں یا ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی، سنیتی کمار چٹرجی ہوں یا عین الحق فرید کوٹی، گریرسن ہوں یا ڈاکٹر جمیل جالبی سب ہی اس معروضی حقیقت کو مانتے ہیں۔ چنانچہ اردو زبان کے حوالے سے بھی یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے اہل عرب کا اہل سندھ سے ملاپ ہو یا اہل فارس کا اہل پنجاب سے۔ ہندی دکھنی سے ملی یا بنگالی انگریزی سے، شاہجہان آباد میں سپاہی پیشہ جمع ہوئے یا صوفیائے کرام کے آستانوں پر عوام وخواص کا اجتماع ہوا، نتیجۃً کم وبیش ایک ہزار برس کے سماجی عمل کے دوران اردو زبان کی تشکیل وتعمیر ہوتی چلی گئی۔ قیام پاکستان کے حوالے سے بھی اردو زبان کا تاریخی اور تابناک کردار فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

کروڑوں لوگ لمحہ موجود میں اردو زبان کے ارتقاء اور ترویج واشاعت میں ممد ومعاون ثابت ہو رہے ہیں۔ حکومتی سرپرستی کے بغیر پاکستان کے اندر اور باہر یہ سلسلہ تیزی سے جاری ہے۔ اب اردو کا وہ دائرہ مکمل ہو چکا ہے جس کا ذکر ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیا ہے۔ [4] اب وسیع تر دائرے تشکیل پا رہے ہیں اور یہی ہمارا اصل موضوع ہے۔ یہ دائرے دنیا بھر میں پھیلتے ہوئے اردو کے عالمی مراکز پر مشتمل ہیں۔

پاکستان سے باہر جھانکیے تو بہت سے ممالک میں اردو کی نئی بستیاں آباد ہو چکی ہیں۔ ٹوکیو سے ٹورانٹو تک، کاشغر سے کلکتہ تک اور بیجنگ سے مکہ مدینہ تک اردو کتابوں کی دکانیں، مدارس، اخبارات و رسائل اور ٹی وی چینلز کام کر رہے ہیں۔ جمیل الدین عالی نے تو اسی (۸۰) کی دہائی میں ہی کہہ دیا تھا۔

اتنی بار 'بلایا' مجھ کو سننے مرا کلام
کہیں کراچی پڑ نہ جائے ٹورانٹو کا نام

''دعوت وتبلیغ'' کے نام سے اس وقت دنیا بھر میں جو محنت ہو رہی ہے اس سے بھی اردو زبان کے دامن میں عالمی وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ جس طرح اس مبارک محنت کا ہدف مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہے، اس طرح اردو زبان کی وسعت اور اثر پذیری بھی نئی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔ چونکہ اس دینی محنت کا مرکز برصغیر میں بالخصوص پاکستان (رائیونڈ) میں ہے لہٰذا فطری طور پر پاکستان کی قومی زبان اردو اس محنت میں ایک بہت توانا کردار ادا کر رہی ہے۔ اس حوالے سے نامور عالمی مبلغ مولانا طارق جمیل کی فصیح وبلیغ اردو خطابت کا بھی ایک اہم حصہ ہے۔ ایسے خطیبان اردو کو ہر دور میں میسر رہے ہیں۔

ہر سال کم وبیش ایک سو سے زائد ممالک کی

بڑی بڑی تبلیغی جماعتیں سالانہ اجتماع میں شرکت کے لئے (رائیونڈ) پاکستان میں آتی ہیں۔ اندرون اور بیرون ملک سے کم وبیش 25 تا 30 لاکھ لوگ سالانہ اجتماع میں شرکت کرتے ہیں۔اب انتظامی وجوہ کی بنا پر سالانہ اجتماع کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مشنری جذبے سے معمور یہ لاکھوں لوگ آپس میں ہر سال تقریباً ایک ماہ تک معاشرتی اور روحانی تعامل (Social and spirtual inetraction) کرتے ہیں اور اس سارے پراسس میں اردو رابطہ کی مرکزی زبان ہوتی ہے۔ اجتماع کے بعد ہزاروں جماعتیں نا صرف ملک کے اندر پھیل جاتی ہیں بلکہ ڈیڑھ سو ممالک کا رخ بھی کرتی ہیں۔اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اردو زبان دنیا بھر میں کن کن انجانے گوشوں تک پہنچ رہی ہے۔ ہزاروں جماعتیں دنیا بھر کی مساجد میں جاگزیں ہوتی ہیں۔ زبانی بیانات بھی ہوتے ہیں اور اہل محلہ سے گراس روٹ لیول پر انٹرایکشن بھی ہوتا ہے۔دن رات میں دو بار ''فضائل اعمال'' کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ تعلیم اور یہ بیانات بالعموم اردو زبان میں ہوتے ہیں۔''فضائل اعمال'' میں مولانا محمد زکریاؒ نے قرآن کی عظمت، احادیث مبارک، صحابہ کرامؓ کے ایمان افزا واقعات کے ساتھ ساتھ عربی فارسی اور اردو کے برمحل اشعار بھی استعمال کئے ہیں، لاکھوں لوگ روزانہ اس متن کو پڑھتے ہیں۔

تبلیغی جماعت ہمارے خصوصی شکریہ کی مستحق ہے کہ عالمی اور علاقائی زبانوں کی آمیزش کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے کلاسیکی حسن کو بھی قائم رکھے ہوئے ہے۔اب جبکہ اردو کے پروفیسر بھی انگریزی ہندسے استعمال کرتے ہیں،تبلیغی مرکز رائیونڈ کے تمام ستونوں کے نمبر اردو میں لکھے ہوئے ہیں۔ بات صرف ہندسوں کی نہیں بلکہ ٹیلی ویژن چینلز میں بھی انگریزی الفاظ کی بھرمار کے برعکس تبلیغی جماعت میں میٹنگ کی بجائے جوڑ یا اجتماع،کینٹین کی بجائے مطبخ کہا جاتا ہے۔اسی طرح چلہ،تشکیل،مشورہ اور دعوت جیسی اصطلاحات عام روانی سے بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔طوالت کے پیش نظر اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ ورنہ یہاں ایک جہان آباد ہے جس میں اردو زبان کے بے شمار امکانات پوشیدہ ہیں۔

دینی اور سیاسی جماعتوں کا ہمیشہ سے اردو زبان کے ساتھ خصوصی لگاؤ رہا ہے۔ جماعت اسلامی اور منہاج القرآن انٹرنیشنل کی طرف سے تیار کردہ اردو لٹریچر یا اس کا ترجمہ دنیا بھر میں پھیل رہا ہے سلیم احمد کے بقول

تیرے سانچے میں ڈھلتا جا رہا ہوں
تجھے بھی کچھ بدلتا جا رہا ہوں

شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی سائنٹیفک اپروچ، استقامت اور انقلابی وژن کے ساتھ ۸۰ سے زائد ممالک میں'' منہاج القرآن انٹرنیشنل'' کا نیٹ ورک مستعدی کے ساتھ مصروف کار ہے۔ پاکستان،کینیڈا، بھارت،ناروے،انگلینڈ اور بیسیوں مراکز میں اشاعت دین کا کام جاری ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں لانگ مارچ اور دھرنوں نے ایک نیا باب رقم کیا ہے۔اس موقع پر جہاں اردو زبان کا دامن شیخ الاسلام کی انقلابی اور آئینی تقاریر سے مالا مال ہوا ہے وہاں قومی اور بین الاقوامی سطح پر عوامی شعور بھی پیدا ہوا ہے اور بلاشبہ عالمی سطح پر اُردو زبان کے دامن میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔

علاوہ ازیں بیسیوں ممالک کی طرف سے اردو تعلیم وتدریس کیلئے یونیورسٹی کی سطح پر انتظامات کئے گئے ہیں۔مثلاً ایران اور جاپان میں شعبہ ہائے اردو کم وبیش نصف صدی سے جاری ہیں۔ ترکی کی تین یونیورسٹی (استنبول،انقرہ اور قونیہ) میں،مصر کی جامعہ ازہر میں کئی دہائیوں سے ایم اے، پی ایچ ڈی تک اردو پڑھائی جاری ہے۔ چین کی بیجنگ یونیورسٹی میں شعبہ اردو خاصا فعال ہے۔ چین کے انتخاب عالم باقاعدہ شاعری کرتے ہیں، اسی طرح کیمبرج، آکسفورڈ،ٹورانٹو، میونخ، اور شکاگو میں بھی شعبہ ہائے اردو، اردو مراکز، ادبی تنظیمیں اخبارات اور رسائل سرگرم عمل ہیں۔ اگر پاکستان کے اندر کالے انگریزوں نے اردو کا راستہ روک رکھا ہے تو کیا ہوا اس میٹھی مستانی زبان کے دائرے دنیا بھر میں پھیل رہے ہیں۔ (۵)

(۲۰۰۵ء/۲۰۱۵ء)

حوالہ وحواشی:

۱۔ برموقع عالمی اردو کانفرنس ۲۲،۲۳ را کتوبر ۲۰۱۳ء،لاہور

۲۔سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز اور شعبہ جنوبی ایشیا لندن یونیورسٹی کے نامور محقق جنہیں حکومت پاکستان نے اُردو خدمات کے حوالے سے'' ستارہ امتیاز'' سے نوازا ہے۔

۳۔صدر شعبہ اُردو، تاشقند یونیورسٹی، روزنامہ خبریں لاہور پاکستان 25 اپریل 2015 / بحوالہ واشنگٹن پوسٹ، یوایس اے۔

۴۔جمیل جالبی، ڈاکٹر (1975) '' تاریخ ادب اردو''،لاہور مجلس ترقی ادب

۵۔الحمدللہ عدالت عظمیٰ پاکستان کے چیف جسٹس جو اد ایس خواجہ نے ۸ ستمبر ۲۰۱۵ء کو اُردو کو بطور آئینی اور سرکاری زبان نافذ کرنے کے احکامات جاری کر دیے ہیں۔ مستقبل میں اس فیصلے کے دیرپا اثرات مرتب ہوں گے۔

ارژنگ کا ارتقاء

عامر بن علی

وفاقی اردو جامعہ اسلام آباد کی طالبہ عاصمہ بیگم ماہنامہ ارژنگ پر ایم فل کی ڈگری کے لیے تحقیق کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سارے سوالات ہیں جن کے جوابات یہ ذہین طالبہ چاہتی ہے۔ سوالات کا خلاصہ بیان کروں تو وہ بنیادی طور پر ارژنگ لاہور کا تعارف اور ارتقاء ہے۔ یہ موضوع ایسا ہے جس سے ہمارے تقریباً تمام قارئین کی کچھ نہ کچھ دلچسپی ضرور ہو گی۔ آج ہی مجھ سے میری مرحومہ دوست رخسانہ نور اور سید نور کی صاحبزادی قرۃ العین رینو پوچھ رہی تھی کہ ارژنگ کا مطلب کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ اردو زبان میں تصویری البم کو ارژنگ کہتے ہیں، گو کہ یہ لفظ ہمارے ہاں زیادہ مستعمل نہیں ہے مگر تصویروں کے مجموعے کے لیے فارسی اور اردو زبان میں یہی واحد لفظ ہے۔

تاریخی حوالے سے بات کریں تو تیسری صدی عیسوی میں ایران سے مانی ازم کے نام ایک مذہب کی ابتداء ہوئی، مانویت کے نام سے معروف ہونے والے اس مذہب کا بانی مانی نامی مصور اور نقاش تھا۔ اس نے تصاویر کی مدد سے اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچایا۔ ان تصاویر کو کتابی شکل دی گئی اور اس کتاب کا نام "ارژنگ" رکھا گیا۔ وقت کے ساتھ مانی کا مذہب اور اسکی کتاب "ارژنگ" ناپید ہو گئی مگر تصاویر اور اریمک زبان میں تحریر کردہ اس کتاب کا نام تاریخ کا ایک حوالہ بن گیا۔ یاد رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اریمک زبان میں ہی گفتگو کیا کرتے تھے۔ تیسری صدی سے لیکر ساتویں صدی عیسوی تک عیسائیت کے مقابلے میں ایشیاء اور یورپ میں سب سے بڑا حریف مانی کا مذہب تھا۔ ایک طرف چین اور دوسری طرف رومن سلطنت تک پھیلے ہوئے مانی کے مذہب کی ابتداء در حقیقت میسوپوٹیمیا، عراق میں ہوئی جو اس وقت ایران کے زیرِ نگیں تھا مگر ہمارا موضوع تو "ارژنگ" ہے، جس کی ایک محفوظ جلد افغانستان کے شہر غزنی سے تیرہویں صدی عیسوی میں برآمد ہوئی۔

ارژنگ کے نام سے ایران اور آذربائیجان کے علاوہ چین میں شہر بسائے گئے۔ جو کہ آج بھی آباد ہیں۔ چین میں تو "ارژنگ" کے نام سے مانی کی آرٹ گیلری بھی قائم کی گئی ہے۔ فردوسی کے شاہنامہ میں ارژنگ کے نام سے ایک اہم کردار بھی ہے مگر 1999 میں جب میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر جن میں ابرار ندیم سرفہرست تھے اور تب وہ ابرار احمر کہلاتے تھے، ارژنگ کے نام سے ادبی پرچہ نکالنا چاہا تو فردوسی کی بجائے منیر نیازی کا نام ہمارے ذہن میں آتا تھا جو اسی نام سے پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں اس نام سے پرچہ نکالتے رہے۔ منیر نیازی سے ہماری بڑی قربت تھی اور ان کی میزبانی کا شرف بھی ہمیں بارہا حاصل رہا، اس معاملے میں ان کی آشیرباد ہمیں حاصل تھی۔ سن 2000ء میں ہمیں "ارژنگ" کا ڈیکلریشن مل گیا جو ہمارے لیے نئی صدی کا تحفہ بھی تھا۔

ابتداء میں ارژنگ اخبار کی شکل میں شائع ہوتا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انٹرنیٹ ابھی اپنی ابتدائی شکل میں تھا، سوشل میڈیا کا وجود نہیں تھا۔ ملک کے تمام اخبارات، چاہے وہ اردو تھے یا پھر انگریزی، ادب اور ادیبوں کو بس اتنی ہی جگہ دیتے تھے، جتنی آج کل دیتے ہیں۔ ایسے عالم میں بڑے بڑے ادیب دنیا سے رخصت ہو جاتے اور لوگوں کو مہینوں بعض اوقات سالوں تک خبر نہ ہوتی تھی کہ ساقی فاروقی اب اس عالمِ رنگ و بو میں نہیں رہے ہیں۔ ایسے عالم میں تازہ ادبی تخلیقات اور شاعری کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اہم ادبی خبروں کی اشاعت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ہم دوستوں نے اس مشکل کام کا بیڑہ اٹھایا اور گزشتہ 18 سال سے ارژنگ لاہور مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

ان 18 برس میں دو اہم تبدیلیاں آئیں پہلی تبدیلی اخبار کی شکل سے ارژنگ کا کتابی صورت اختیار کرنا ہے۔ اس کا بنیادی محرک تو احمد ندیم قاسمی صاحب کا مشورہ تھا، جو ہماری ٹیم یعنی میرے، ابرار ندیم، ڈاکٹر صغرا صدف اور حسن عباسی کے لیے استاد کی حیثیت رکھتے تھے، ان کا مشورہ تھا اخبار کی کوئی "شیلف لائف" نہیں ہوتی، اسے میگزین کی شکل دے دیں، زیادہ معتبر اور خوبصورت لگے گا۔ بلکہ انہوں نے تو ہمارے آٹھ صفحات کے اخبار کو اپنے ہاتھوں سے چونسٹھ صفحات کا میگزین بنا کر بھی دکھایا تھا۔ میں خود بھی محسوس کرتا تھا کہ ہمارے گھر کے کچن میں "ارژنگ" خانسامائیں بطور تولیہ بھی کبھی کبھی استعمال کر لیتی ہیں، اور اس ناگہانی صورت حال میں مجھے دیکھ کر وہ ذرا سا شرماتی بھی نہیں ہیں۔ اس بابت دوسرا محرک انٹرنیٹ کے خیرہ کن پھیلاؤ کے ساتھ سوشل میڈیا کی آمد تھا۔ اب کوئی خبر پوشیدہ نہیں رہتی، چاہے ہمارا مین سٹریم میڈیا اسے نظرانداز ہی کیوں نہ کر دے۔ اس لیے خبری ضرورت بڑی حد تک سوشل میڈیا نے پوری کرنا شروع کر دی تو ہم نے فیصلہ کیا کہ ارژنگ اب میگزین کی شکل میں شائع ہوگا اور تخلیقی ادب کی اشاعت اس کی ترجیح ہوگی، پختہ ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھرپور موقع فراہم کیا جا

ے گا کہ اپنی تخلیقات قارئین کے سامنے پیش کریں۔

ارژنگ کے اس ارتقائی سفر میں دوسری بڑی تبدیلی ادارت کی تھی۔ بانی مدیر ابرار ندیم چونکہ ریڈیو کے پروڈیوسر ہونے کے علاوہ اور بھی براڈکاسٹنگ کے لیے تخلیقی کام کرتے تھے، ان کی مصروفیت حد سے بڑھی تو انہوں نے ادارت ڈاکٹر صغرا صدف کے سپرد کر دی، ڈاکٹر صغرا نے بڑی محنت اور محبت سے چند سال ارژنگ کو شائع کیا مگر وہ بھی چونکہ پنجاب انسٹیٹیوٹ کی ڈائریکٹر جنرل ہیں لہذا انتظامی مصروفیت کے باعث باہمی مشاورت سے یارِ دیرینہ اور خوبصورت شاعر حسن عباسی کو ارژنگ کی ادارت سنبھالنے کے لیے درخواست کی گئی۔ جو گزشتہ چھ سال سے انتہائی محنت، لگن اور انہماک سے ارژنگ لاہور شائع کر رہے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ پرانے مدیران بھی مجلس ادارت میں نہ صرف شامل ہیں بلکہ پرچے کی اشاعت میں بھرپور حصہ ڈالتے ہیں۔ ارژنگ کی باقی پوری ٹیم میں بھی بنیادی نقطہ، اشتراک باہمی دوستی ہے، دراصل ہم سب آپس میں بہت گہرے، اور اب تو پرانے بھی ہوتے جا رہے ہیں، انتہائی قریبی دوست ہیں۔ معیاری شعر و ادب سے محبت اور اس کی ترویج کا جذبہ ارژنگ لاہور کی ٹیم میں قدرِ مشترک ہے۔

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140 روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350 روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200 روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200 روپے
اردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700 روپے
اردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150 روپے
اردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700 روپے
اردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800 روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200 روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400 روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300 روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500 روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250 روپے
اردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500 روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250 روپے
ادبی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250 روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400 روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200 روپے

ناشر: القمر انٹرپرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا مجلہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگِ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

عمران اور خواب

نازاوکاڑوی

عمران شناور سے پہلی چند ملاقاتوں کے بعد وہ مجھے اچھا لگا۔ اور اس کی شاعری سننے کے بعد میں اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا قائل ہوگیا۔ کام کے سلسلے میں اکثر اس کے ہاں جانا پڑتا۔ عمران اپنے کام میں مصروف باتوں میں ہاں ملاتے کچھ شرماتے اور نیچی نگاہیں کیے بڑی متانت کے ساتھ مسکراہٹ بکھیر کر اپنے کام میں مگن ہو جاتے۔ بھلا ہو فیس بک کا جو سینکڑوں ہزاروں میلوں دور بیٹھے جانے اور انجانے دوستوں سے شناسائی کا موقع فراہم کر رہا ہے۔ فیس بک سے پتہ چلا کہ موصوف شرمیلے شرمیلے سے حضرت ایک عدد مجموعہ کے مالک ہوگئے ہیں۔ میں نے فیس بک پر مجموعہ کی مبارک باد دی انہوں نے شکریہ کا میسج بھیجا۔ میں فوراً رابطہ نہ کر سکا کہ میں بھی دفتری کاموں میں مصروفیت کی بنا پر بالمشافہ ملاقات اور مبارک باد نہ دے سکا۔ ایک روز اسی قصد سے گیا کہ خود جا کر مبارک باد کہوں' پہنچا تو پتہ چلا صاحب دفتری ذمہ داریوں کے ساتھ گھریلو ذمہ داریاں بھی اسی جذبہ سے نبھا رہے ہیں جیسے دفتری یعنی اپنے آبائی شہر بچوں کے پاس گئے ہوئے ہیں پھر اطلاع ملی عمران صاحب اپنے فرائض منصبی کے لیے واپس آ چکے ہیں۔ اس بار ملاقات کچھ اور حساب سے ہوئی۔ عمران صاحب کرسی سے اٹھ کر بغل گیر ہوئے میں نے گلے لگاتے ہوئے مجموعہ کی ڈھیروں مبارک دی۔ عمران صاحب نے دستخط شدہ مجموعہ بھی مجھے عنایت کیا۔ جو اَب میری لائبریری کی زینت بنا ہوا ہے۔ میں جب بھی اپنے مکتبہ میں کچھ لکھنے بیٹھتا تو عمران صاحب میری طرف جھانک رہے ہوتے۔ انہیں اس طرح مسکراتا جھانکتا دیکھ کر میں بھی زیر لب مسکرا دیتا اور کہتا بے شک! بے شک! آپ کے مجموعہ کے لیے مجھے کچھ لکھنا ہے۔ قارئین! یہ ہر لکھاری کا حق ہے اور دوسرے لکھاری پر فرض ہے کہ وہ اس کی کاوش کو طائرانہ نہیں بلکہ گہری نظر سے مطالعہ کے بعد اس کی حوصلہ افزائی کرے تاکہ اسے مزید کام کرنے کا حوصلہ پیدا ہو۔

بے شک عمران کا یہ پہلا مجموعہ ہے تو جوان ہے ذہن زرخیز ہے اور محنت کر کے آنے والی فصلوں کی بہترین اور بھرپور کاشت کر سکتا ہے۔ جیسا کہ باقی صاحب نے انہیں ''نئی بستیوں کا شاعر'' قرار دیا ہے۔ یقیناً یہ نوجوان ہے کام کرنے کی امنگ ہے ہمت ہے۔ اپنی نئی جہتوں سے نئی بستیاں بسا سکتا ہے۔ بلاشبہ اس نے یہ کوشش کی بھی ہے۔ اس میں یہ خوبی ہے کہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ جو کچھ سیکھا ہے ظاہر کرتا ہے آگے چل کر استاد کا نام روشن اور اپنا نام استادوں کی فہرست میں ضرور لکھانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ شاعری چونکہ الہامی کیفیت پر مشتمل ہوتی ہے لیکن اس میں نکھار' پختگی' چاشنیت' خون ریزی اور جگر سوزی سے کی جاتی ہے۔ راتوں کی نیندیں تیاج کر سنگلاخ چٹانوں کو چیر کر بھٹی میں جل کر ہی کندن ہونا پڑتا ہے۔

عمران بھی ان کیفیات سے گزر رہا ہے۔ اس کے شعروں کی اٹھان آنے والی منزلوں کا پتہ دیتی ہے۔

عمران نے ہر قسم کی شاعری کر کے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ ہر صنف کو استعمال کرنا جانتا ہے۔ مجموعہ میں غزل' نظم' نثری' قطعات بھی شامل ہیں۔ خاص کر چھوٹی بحر میں لکھی غزلوں میں موسیقیت کا بھرپور عنصر شامل ہے۔ جیسا کہ غزل روایتی طور پر حسن وعشق پر ہی مبنی ہے۔ کوکہ یہ موضوع زمانہ قدیم سے ہی چلا آ رہا ہے اور آج بھی مروج ہے اور اس کے بغیر غزل میں وہ چاشنی بھی نہیں آ سکتی بغیر حسن وعشق کے۔ لیکن عمران شناور نے اس روایتی موضوع کو بھی جدید انداز میں استعمال کر کے اپنی ہنرمندی کا ثبوت مہیا کیا ہے۔ یہاں ان کے چند شعر آپ کی ذوقِ سماعت کے لیے پیش کرنا چاہوں گا۔

جس نے بھی مجھ کو تماشا سا بنا رکھا ہے
اب ضروری ہے وہی شخص تماشائی ہو
میں تجھے جیت بھی تحفے میں نہیں دے سکتا
چاہتا یہ بھی نہیں ہوں تری پسپائی ہو

لیکن عمران شناور صرف حسن وعشق کا دلدادہ نہیں وہ اپنے اردگرد بھی نظر رکھتا ہے۔ اسی سماج بھی رہتے ہوئے ہونے والے واقعات سے آنکھیں موند کر نہیں بلکہ کھول کر چلتا' دیکھتا اور پھر کہہ اٹھتا ہے:

لوگ پابند سلاسل ہیں مگر خاموش ہیں
بے حسی چھائی ہے ایسی گھر کے گھر خاموش ہیں
اپنے ہی گھر میں نہیں ملتی اماں تو کیا کریں
پھر رہے ہیں مدتوں سے دربدر خاموش ہیں

اب دیکھیے اپنے خوابوں کے بارے میں کس خوبصورتی سے اشارہ کرتے ہیں۔ ہر انسان خواب دیکھتا ہے۔ کچھ خواب وہ ہوتے ہیں جو نیند میں دیکھے جاتے ہیں اور کچھ خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ جاننے والے ان دونوں خوابوں کی حقیقت اور اہمیت کو بخوبی جانتے ہیں۔ خاص کر سوتے ہوئے دیکھے اچھے خواب کی تعبیر ہر کوئی چاہتا ہے۔ انہی لوگوں میں سے عمران نے بھی خواب دیکھ کر

ہی تو کہا ہے۔

ستارے سب مرے مہتاب میرے
ابھی مت ٹوٹنا اے خواب میرے

یہاں دیکھیے عمران شناور اتنی چھوٹی بحر میں اتنی بڑی اور جامع بات کس مہارانہ طریقے سے کر رہے ہیں یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ چھوٹی بحر کو لے کر چلنا کس قدر محال ہوتا ہے۔ یہاں عمران کو داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔

ہر خوشی کی موت ہیں
بے لگام خواہشیں

ڈھیر ہیں اناجوں کے
بس ہمیں دکھانے کو

یہ شاعر ہی جانتا ہے کہ اپنے الفاظ کو شعری روپ دیتے ہوئے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں بھی عمران نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ کہتے ہیں۔

پھوٹ کر رونے لگا کھلتا گلاب
ساتھ مل کر خار دشمن ہو گئے

یہاں ان اپنوں کی بیگانگی کا بھی رونا ہے اور روزمرہ ساتھ کام کرنے والے ان ساتھیوں کا بھی۔ حوادثِ زمانہ اور رشتوں کی اجنبیت کا بھی رونا ہے کہ ایک ساتھ رہتے ہوئے ایک گام چلتے ہوئے لوگ کس طرح ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔

اس مجموعہ میں نظمیں دو تین ہی ہیں۔ زیادہ رجحان غزل کا ہی ہے۔ بہرحال عمران شناور نے بھرپور شاعری کی ہے۔ پڑھنے والوں کو ضرور پسند آئے گی۔ میری دعا ہے عمران شناور کا قلم عمران کے ساتھ قدم قدم دوڑے۔ عمران مبارک کا حق دار ہے۔

عمران! تمھیں بہت بہت مبارک اور دعا ہے تمہارا خواب کبھی نہ ٹوٹے۔

ماہنامہ ''ارژنگ'' کو وصول ہونے والے ادبی جرائد

ماہنامہ طلوعِ اشک

چیف ایڈیٹر: رائے عابد علی

قیمت فی شمارہ: -/۱۰۰ روپے

رابطہ: ۰۳۰۰-۴۸۵۰۴۶۱

ششماہی ترنجن

چیف ایڈیٹر: ڈاکٹر اصغر صدف

قیمت فی شمارہ: -/۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج، آرٹ اینڈ کلچر، نزد قذافی سٹیڈیم لاہور

ماہنامہ نوائے ادب

مدیرِ اعلیٰ: صدام ساگر

فی قیمت شمارہ: -/۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: سکن سنٹر بالمقابل دفتر فوڈ سول ہسپتال روڈ، گوجرانوالہ

ششماہی رنگِ ادب

مدیر: شاعر علی شاعر

قیمت فی شمارہ: -/۵۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: رنگِ ادب پبلی کیشنز آفس نمبر ۵ کتاب مارکیٹ اردو بازار کراچی

ماہ نامہ مجلس ترقی ادب

مدیر: محمد ظہیر بدر

ملنے کا پتہ: نرسنگھ داس گارڈن کلب اڈا اپر مال لاہور

ماہنامہ بیاض

مدیر: عمران منظور

قیمت فی شمارہ: -/۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ۔ ریاض گروپ آف پبلی کیشنز سید اطہر شہید روڈ ۱۶ کلومیٹر ملتان روڈ لاہور

ماہنامہ تخلیق

مدیر: سونان اظہر جاوید

قیمت فی شمارہ: -/۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: ہاؤس نمبر ۱۲/۴ شیراز ولاز فیز اسلام نگر والٹن روڈ لاہور کینٹ

سہ ماہی چہارسُو

مدیر: سُول گلزار جاوید

قیمت فی شمارہ: -/۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: d-1 ۵۳۷ گلی نمبر ۱۸ ویسٹریج ااا راولپنڈی

ماہنامہ سنتیہا

چیف ایڈیٹر: عاشق رحیل

ایڈیٹر: نازاوکاڑوی

قیمت فی شمارہ: -/۵۰ روپے

سینئر گدھے

عطاء الحق قاسمی

زندگی کے مختلف شعبوں میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو ایک عمر اس شعبے میں گزارنے کے باوجود اپنے نامہ اعمال میں کوئی نیکی درج نہیں کرا سکتے یعنی انہوں نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا جس پر وہ فخر کر سکیں، وہ صرف اپنی سنیارٹی پر فخر کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ناقدری کا رونا بھی بہت روتے ہیں اور جب ان سے پوچھا جائے کہ بھائی وہ وجوہات بتائیں جن کی بناء پر آپ کی قدر کی جائے تو وہ جواب میں صرف یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ وہ گزشتہ اتنے برسوں سے اس شعبے میں کام کر رہے ہیں مگر انہیں پوچھتا کوئی نہیں۔ کچھ ستم ظریفوں نے ایسے لوگوں کے لیے ''خر کہنہ مشق'' کی ترکیب ایجاد کی ہے جسے آسان لفظوں میں ''سینئر گدھے'' کہا جا سکتا ہے۔ گزشتہ روز مختلف شعبوں کے سینئر گدھوں سے میری ملاقات ہوئی جن کا احوال درج ذیل ہے تاہم یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ کالم صرف ان نام نہاد سینئرز کے بارے میں ہے جو اپنا کام نہیں جانتے۔ اگر کہیں حقیقی سینئرز کی حق تلفی ہو تو یہ واقعی شرمناک فعل ہے کہ یہ لوگ قوم کا سرمایہ ہیں۔

'' بھائی صاحب! آپ نے ٹی وی کا مشاعرہ دیکھا؟''

''دیکھا تھا''

''آپ نے دیکھا اس فقیر کے ساتھ کتنی زیادتی کی گئی؟''

''کیوں کیا ہوا؟''

''کمال ہے آپ کو میرے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس ہی نہیں ہوا؟''

''مگر ہوا کیا؟''

''صاحب! بہت سے جونیئر شعرا کی موجودگی میں مجھے سب سے پہلے پڑھایا گیا!''

''یہ تو ٹی وی والوں نے واقعی زیادتی کی حالانکہ آپ کو تو اس سے بھی کچھ پہلے پڑھانا چاہیے تھا''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میرا شمار ملک کے سینئر شعراء میں ہوتا ہے!''

''آپ کا کوئی ایسا شعر جو آپ کی پہچان بنا ہو؟''

''صاحب! آپ شعر کو چھوڑیں، میری ڈیٹ آف برتھ دیکھیں۔ یہ جو بڑے شاعر بنے پھرتے ہیں میرے سامنے کل کے لونڈے ہیں۔ افسوس ہم جیسے لوگوں کی قدر رہی نہیں جنہوں نے ایک عمر اس شعبے میں گزاری ہے''

یہ جو آپ نے ڈرامے کا سین لکھا ہے۔ اس میں تو میں بالکل دب کے رہ جاؤں گا!''

''کیا مطلب؟''

''دیکھیں نا سین میں میرے مدمقابل جو ایکٹر ہے، وہ اپنی اچھل کود سے ناظرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لے گا۔ ہم سینئر لوگ اس طرح کے کام تو نہیں کر سکتے جو یہ کل کے لونڈے کر لیتے ہیں، ایسے سین میں میری موجودگی سے میرا وقار مجروح ہوگا!''

''ماشاء اللہ ویسے آپ کتنے عرصے سے ڈراموں میں کام کر رہے ہیں؟''

''جب سے پاکستان میں ٹیلی ویژن آیا ہے''

''اب تک آپ نے کتنے سیریلز کیے ہیں؟''

''بے شمار، مجھے تو تعداد بھی یاد نہیں''

''کوئی ایسا سیریل جو آپ کی وجہ سے ناظرین میں مقبول ہوا ہو؟''

''آپ اس بات کو چھوڑیں، صرف میری سینارٹی دیکھیں، میں ٹی وی کا سب سے پرانا اداکار ہوں!''

''آپ دیکھ رہے ہیں سیاست میں آج کل کن لوگوں کو لفٹ مل رہی ہے؟''

''کن لوگوں کو مل رہی ہے؟''

''جو کل تک ہمارے حقے تازہ کرتے تھے''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''فرق تو پڑتا ہے جناب! یہ لوگ ہمارے منہ لگ رہے ہیں جن کی ساری عمر سیاست میں گزری ہے جبکہ یہ لونڈے گزشتہ دو چار برسوں کی پیداوار ہیں!''

''مگر ان میں خرابی کیا ہے؟''

''یہ ہم بزرگوں کو چیلنج کرتے ہیں، حالانکہ علامہ نے ان جیسوں کے بارے میں کہا تھا

نئی تہذیب کے گندے ہیں انڈے
اٹھا کر پھینک دو ان کو گلی میں

''مگر بزرگوارم، علامہ نے جب یہ شعر کہا تھا، اس وقت آپ ان لوگوں کی عمر کے تھے!''

’’چالیس سال سول سروِنٹ کے طور پر قوم کی خدمت کی مگر........‘‘

’’مگر کیا؟‘‘

’’جب سے ریٹائرڈ ہوا ہوں کوئی سلام کرنے ہی نہیں آیا۔ نہ کبھی حکومت نے جھوٹے منہ کہا کہ ہم تمہارے تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں‘‘

’’آپ نے ان چالیس برسوں میں حق داروں کی فائلیں روکنے کے علاوہ کیا کام کیا جس کی وجہ سے لوگ آپ کو سلام کرنے کے لیے حاضر ہوں اور حکومت آپ کے تجربے سے فائدہ اٹھائے؟‘‘

’’تو کیا ہر حکومت ایسے بیوروکریٹس کی ضرورت نہیں ہوتی جو حق داروں کی فائلوں کو راستے ہی میں روک لے؟‘‘

’’ہوتی ہے، مگر اس کام کے لیے ان کے پاس نوجوان افسر بھی خاصی تعداد میں موجود ہوتے ہیں!‘‘

’’وہ ٹھیک ہے لیکن رکاوٹیں ڈالنے کا کام جس احسن طریقے سے ہم کر سکتے ہیں۔ وہ آج کے لونڈے کیا جانیں ۔ صاحب تجربے کا کوئی بدل نہیں لیکن ہمارے ہاں سینئر لوگوں کی قدر ہی نہیں‘‘

’’آپ کو پتا ہے وزیراعظم کی عمر کتنی ہے؟‘‘

’’وہ شاید فورٹیز میں ہیں!‘‘

’’اور آپ کو پتا ہے میری عمر کتنی ہے؟‘‘

’’آپ تو ماشاءاللہ خاصے کھانگڑ ہیں‘‘

’’آپ نے یہ لفظ اچھا استعمال نہیں کیا تاہم شکر ہے آپ کو احساس ہے کہ میں خاصا بزرگ ہوں‘‘

’’اس میں کیا شبہ ہے؟‘‘

’’مگر بیماری کے باوجود ہر دفعہ مجھے ٹرخا دیا جاتا ہے۔ لگتا ہے اس ملک کو اب تجربہ کار لوگوں کی ضرورت نہیں رہی!‘‘

’’آپ گزشتہ 50 برس سے کسی نہ کسی صورت میں برسرِاقتدار طبقے میں شامل رہے ہیں۔ آپ کے تجربے سے ملک اور قوم کو کیا فائدہ پہنچا؟‘‘

’’آپ کج بحثی سے کام لے رہے ہیں، میں بزرگی کی بات کر رہا ہوں۔ آپ ملک و قوم کے لیے مفاد کو لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ افسوس سینئر لوگوں کی کوئی قدر ہی نہیں ہے!‘‘

شعری مجموعہ

زیویں سدھراں دی

شاعر:

ظفر اعوان

صفحات: 160 قیمت: 400روپے

ناشر

نستعلیق مطبوعات

فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

اصغر گونڈوی

وہ نغمہ، بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے، چمن بیدار ہو جائے
نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں کے پار ہو جائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے بیکار ہو جائے
تم اُس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو
جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خمدار ہو جائے
سحر لائے گی کیا پیغامِ بیداری شبستاں میں
نقابِ رُخ اُلٹ دو، خود سحر بیدار ہو جائے
نظر اُس حسن پر ٹھہرے، تو آخر کس طرح ٹھہرے
کبھی خود پھول بن جائے، کبھی رُخسار ہو جائے
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

....

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رُخ پر تری زُلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا
آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے
میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا
اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پرآشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا
ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت
میں نے کبھی روئے شبِ ہجراں نہیں دیکھا
روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا
کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں، یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا
شائستۂ صحبت کوئی ان میں نہیں اصغر
کافر نہیں دیکھے، کہ مسلماں نہیں دیکھا

مومن خاں مومن

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے

تاب نظارہ نہیں آئنہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں
گر وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موج ہوا بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

صبر یارب مری وحشت کا پڑے گا کہ نہیں
چارہ فرما بھی کبھی قیدی زنداں ہوں گے

منت حضرت عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے

تیرے دل تفتہ کی تربت پہ عدو جھوٹا ہے
گل نہ ہوں گے شرر آتش سوزاں ہوں گے

غور سے دیکھتے ہیں طوف کو آہوئے حرم
کیا کہیں اس کے سگ کوچہ کے قرباں ہوں گے

داغ دل نکلیں گے تربت سے مری جوں لالہ
یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہوں گے

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں، وہی خار مغیلاں ہوں گے

سنگ اور ہاتھ وہی وہ ہی سر و داغ جنوں
وہ ہی ہم ہوں گے، وہی دشت و بیاباں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

پھر وہ وحشت کے خیالات ہیں سر میں پھرتے
دشت یاد آتے ہیں، آہو ہیں نظر میں پھرتے

واہ اے طالع برگشتہ کہ وہ پھر ہی گیا
آن کر دیکھ مجھے راہ گزر میں پھرتے

پھرتے دن اپنے تو غیروں کی طرح راتوں کو
کیسے ہم کوچۂ ہم تاب قمر میں پھرتے

منتظر کس کے یہ رہتے ہیں کہ ہم ہر شب کو
تا سحر شام سے اٹھ اٹھ کے ہیں گھر میں پھرتے

ہے زباں بند اثر دل سے شب وصل میں اور
فکر سو سو ہیں دل مرغ سحر میں پھرتے

قلق دل سے ہے جنبش ترے پیکانوں کو
پوچھ مت حال کہ برے سے ہیں بر میں پھرتے

ایک دم گردش ایام سے آرام نہیں
گھر میں ہیں تو بھی ہیں دن رات سفر میں پھرتے

گر گئے تھے تو تسلی کو مری کہہ جاتے
کہ اب آتا ہوں وہ گو آٹھ پہر میں پھرتے

زرد رُخ رنگ طلائی کے ہوئے دیوانے
کیمیا ساز بھی ہیں خواہش زر میں پھرتے

سرمہ گیں چشم کی گردش جو نہ بھا جاتی تو
خاک یوں کاہے کو ہم ڈالتے سر میں پھرتے

جنبش نرگس جنت نے رلایا مومن
چشم کافر کے اشارے ہیں نظر میں پھرتے

جہاں سے شکل کو تیری ترس ترس گزرے
جو تجھ پہ بس نہ چلا اپنے جی سے بس گزرے

جی ہے صور سرافیل آہ بے تاثیر
کہ میرے دم پہ قیامت نفس نفس گزرے

نہ جاؤں کیوں کہ سوئے دام آشیاں سے جب
خیال حسرت مرغان ہم قفس گزرے

ہو اور کو تو ہدایت جو خود ہوں آوارہ
یہ عمر کاش کے جوں نالۂ جرس گزرے

وفائے غیرت شکر جفا نے کام کیا
کہ اب ہوس سے بھی اعدائے بوالہوس گزرے

یہ نیم جان و غم ہجر ہے وہی انصاف
جو تیرے دھیان میں اے مرگ دادرس گزرے

دکھاؤں ناقۂ لیلیٰ خرام ناز تجھے
کبھی ادھر سے جو اس شوخ کا فرس گزرے

کہاں وہ ربط بتاں اب کہ اس کو تو مومنؔ
ہزار سال ہوئے سیکڑوں برس گزرے

صائمہ نورین بخاری

کسی بے نام مرقد کی کوئی پہچان باقی ہے
کہانی مر چکی ہے اور بس عنوان باقی ہے
ابھی کچھ وقت ہے ٹھہرو، ذرا بارش کو تھمنے دو
ہوا کا شور برپا ہے ابھی طوفان باقی ہے
کبھی تو وقت بدلے گا، کبھی تو صبح آئے گی
غریب شہر میں تو بس یہی ایمان باقی ہے
کبھی خاموش ہیں محو تماشا، محو حیرت ہیں
فرشتے ہو چکے ہیں سب کہیں انسان باقی ہیں
مرے دہقان کو ہوگا میسر ابر رحمت کب
زمین کی خشک آنکھوں میں یہی ارمان باقی ہے
سحر کا خواب ہوتے کچھ ستارے مجھ سے کہتے ہیں
کسی کے لوٹنے کا اب بھی کچھ امکان باقی ہے
ہے کے سرمئی منظر میں موسم سرد لہوں کا
مرے دل کے فسانے میں یہی سامان باقی ہے
اچانک دستکیں دینے لگی ہیں یاد کی پریاں
ہوائے فصل گل مجھ پر ترا احسان باقی ہے
مجھے توڑا گیا پھر سے بنایا، پھر مجھے توڑا
فصیل ذات میں بکھرا ہوا سامان باقی ہے
میں کیسے خود بجھا دوں اس چراغ دل کو اے نورین
ہوا کے دوش پر اب تک یہی امکان باقی ہے

دل سے ترے خیال جدا بھی نہ ہو سکے
وہ درد ہیں کہ جن کی دوا بھی نہ ہو سکے
ہر پل تھیں دست و پا میں زمانوں کی بیڑیاں
اس قید میں تھے ہم کہ رہا بھی نہ ہو سکے
منزل کی دھن میں تشنگی بھی ساتھ ساتھ تھی
جاں سے گزرنے والے فنا بھی نہ ہو سکے
سجدے تھے باب عشق کے اب تک جبیں میں ہیں
بار دگر یہ ہم سے ادا بھی نہ ہو سکے
کچھ منزلیں کٹھن تھیں تو کچھ راستے عجیب
کچھ ناخدا تھے ایسے خدا بھی نہ ہو سکے
غیروں کے دکھ خرید کے گھر میں سجا لیے
اپنوں کے غم تھے قرض ادا بھی نہ ہو سکے
یہ فاصلے بھی ساتھ رہے قربتیں بھی ساتھ
اس سے بچھڑ کے اس سے جدا بھی نہ ہو سکے
نورین اشک ضبط کیے، ہونٹ سی لیے
لب اس کے سامنے کبھی وا بھی نہ ہو سکے

سب کچھ ہی بجھ گیا، یہاں کیا پھول کیا چراغ
اس دھند، اس غبار میں کس کو ملا چراغ
داغ فراق عمر ہے میں ہوں، یہ اشک ہیں
اک یاد دل کے طاق پہ جلتی ہے یا چراغ
مابین آسمان و زمیں ایک ربط ہے
یہ رات، روشنی یہ ستارہ، ہوا چراغ
کیا کیا نہ ظلمتوں سے میرا سامنا رہا
جب بھی ہوا کے سامنے لانا پڑا چراغ
اس وقت بھی ہمیں نے جلائی تھیں مشعلیں
جس وقت ڈھونڈنے سے بھی ملتا نہ تھا چراغ
شاید اسی سے ٹوٹے شب تار کا طلسم
ڈھونڈو کہیں سے جا کے پرانا پڑا چراغ
بجھتے ہوئے، بکھرتے ہوئے منظروں کے بیچ
ہر موجہ ہوا سے الجھتا رہا چراغ
اس سبز روشنی میں دعائیں تھیں مستجاب
سجدوں کے ساتھ دل میں جلانا پڑا چراغ

ایک چہرے کو ایک نظر دیکھا
پھر نہ کچھ ہم نے عمر بھر دیکھا
جس میں رستہ نہ کوئی منزل تھی
ہم نے ایسا بھی اک سفر دیکھا
اہل غیرت تو ایک در پہ رہے
بے ضمیروں کو دربدر دیکھا
جان دی اس پہ پھر بھی غیر رہا
معجزہ یہ بھی ہم نے کر دیکھا
کھل گئی اصلیت زمانے کی
یوں تو ہر شخص معتبر دیکھا
اس کی قدرت کے ان گنت جلوے
کم ہی دیکھے ہیں جس قدر دیکھا
شعر کہتی ہو دل سے تم نورین
تم میں بس اک یہی ہنر دیکھا

صائمہ نورین بخاری کا تازہ شعری مجموعہ
سفر آغاز کرتے ہیں
ملنے کا پتہ:
بیکن بکس، فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

سرفراز زاہد

(سرفراز زاہد کے شعری مجموعے "لفظوں سے پہلے" سے منتخب غزلیں)

کنایوں اور تشبیہوں سے پہلے
کہاں ہوتے ہیں ہم لفظوں سے پہلے

کہیں بیٹھا ہوا تھا دل سے لگ کر
جبیں کا داغ کچھ سجدوں سے پہلے

ہمیں برتا گیا خوابوں کے مابین
ہمیں دیکھا گیا، آنکھوں سے پہلے

دریچے نے جگہ لے لی ہے اس کی
تکلف تھا جو دیواروں سے پہلے

کسی پتھر کے سینے میں تھے محفوظ
ہمارے عکس آئینوں سے پہلے

اُترتا ہے کسی امکاں کے اس پار
پہنچتا ہے کہیں رستوں سے پہلے

صفاتِ نور میں ہوتے تھے شامل
یہ سارے عیب ہم ایسوں سے پہلے

بھنور میں مشورے پانی سے لیتا ہوں
میں ہر مشکل کو آسانی سے لیتا ہوں

جہاں دانائی دیتی ہے کوئی موقع
وہاں میں کام نادانی سے لیتا ہوں

وہ منصوبے ہیں کچھ، آباد ہونے کے
میں جن پر رائے ویرانی سے لیتا ہوں

اب اپنے آبلوں کی گھاٹیوں سے بھی
سمندر دیکھ آسانی سے لیتا ہوں

نہیں لیتا مگر لینے پہ آؤں تو
میں بدلہ آگ کا پانی سے لیتا ہوں

نظر انداز کر دیتی ہے جب دنیا
جنم خود اپنی حیرانی سے لیتا ہوں

وہاں مشکل میں پڑ جاتے ہیں گردوپیش
جہاں میں سانس آسانی سے لیتا ہوں

لگاتا ہے مری بینائی پر تہمت
میں فتوے جس کی عریانی سے لیتا ہوں

نظر کچھ سر اُٹھاتے زاویوں پہ
قدم نیچے اُترتی سیڑھیوں پہ

خدا ایمان لے آئے گا اک دن
مری خود ساختہ خوش فہمیوں پہ

گئی تھی بات دروازے سے ہو کر
عبث الزام آیا کھڑکیوں پہ

کسی کی پھول سی باتوں میں آ کر
غزل اک کہہ گئے ہم تتلیوں پہ

گنہ کرتے ہوئے سوچا نہیں تھا
کہ پچھتانا پڑے گا نیکیوں پہ

پھسل جاتا ہے آئے روز کوئی
تری چھنکی ہوئی ہمدردیوں پہ

اجل گہری نظر رکھے ہوئے ہے
مری سانسوں کی بے ترتیبیوں پہ

ٹھہر کر روانی میں جھانکا
خلاؤں سے پانی میں جھانکا

اُفق کے دریچے سے کس نے
مری بے کرانی میں جھانکا

کئی قرن مٹی میں مہکا
پھر اک روز پانی میں جھانکا

بڑھاپے کے زینے سے جھک کر
کسی کی جوانی میں جھانکا

حقیقت سے آنکھیں ہوئیں چار
پلٹ کر کہانی میں جھانکا

انا الحق کی سولی پہ چڑھ کر
تری لن ترانی میں جھانکا

میں لفظوں کی مٹھی سے پھسلا
جب اپنے معانی میں جھانکا

ایسی ویسی پہ قناعت نہیں کر سکتے ہم
دان یہ فقر کی دولت نہیں کر سکتے ہم

اک عداوت سے فراغت نہیں ملتی ورنہ
کون کہتا ہے محبت نہیں کر سکتے ہم

کسی تعبیر کی صورت میں نکل آتے ہیں
اپنے خوابوں میں سکونت نہیں کر سکتے ہم

استعاروں کے تکلف میں پڑے ہیں جب سے
اپنے ہونے کی وضاحت نہیں کر سکتے ہم

شاخ سے توڑ لیا کرتے ہیں آگے بڑھ کر
جن کی خوش بو پہ قناعت نہیں کر سکتے ہم

بے خبر یوں کہ ہر اک بات خبر لگتی ہے
باخبر ایسے کہ حیرت نہیں کر سکتے ہم

افسانہ

اندر کا رنگ

نیلم احمد بشیر

بُت رعنا نے مستعدی سے سلیوٹ مارا تو ایک بار تو کرنل سبحان بھی مبہوت ہو کر اسے تکنے پر مجبور ہو گئے۔ کیا کوئی مرد اتنا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے؟ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ فوج میں رہ کر انہیں پہلے بھی کئی بار اردلی ملتے رہتے تھے مگر اس جیسا بانکا، سجیلا نوجوان کبھی ان کی خدمت کے لیے عطا نہ ہوا تھا۔ سرخ و سپید رنگت، سنہرے گھونگھریالے بال، ستواں ناک، بلوری چمکدار آنکھیں، ایسی نشیلی کہ پل بھر کو تو دیکھنے والا ٹھٹھک کر ہی رہ جائے۔

''یا اللہ شکر ہے میرے گھر کوئی جوان بیٹی نہیں ہے۔'' کرنل سبحان نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ انہوں نے اپنی جوان، خوبصورت، البیلی بیٹی زہرہ کی وقت پر شادی کر دی تھی اور اب وہ اور ان کی بیوی فارغ البال تھے۔ بڑا بیٹا طاہر امریکہ میں ڈاکٹر تھا اور کم کم ہی پاکستان آتا تھا۔ یہ کرنل سبحان کو ریٹائرمنٹ سے پہلے ملنے والا آخری اردلی تھا۔ انہیں اچھی طرح پتہ تھا کہ اس کے بعد انہیں اس قسم کی ذاتی خدمت کروانے کی عیاشی نصیب نہ ہو سکے گی اس لیے وہ اس نعمت کا خوب خوب فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔

''جلدی سے میرے جوتے پالش کر کے لاؤ۔۔۔۔۔۔ یونیفارم ٹھیک سے استری نہیں ہوئی، دوبارہ کر کے لاؤ، میری پسند کی کافی بنا کر لاؤ۔ وہ ہر وقت اس پر حکم چلاتے رہتے اور وہ نظریں جھکائے ان کا حکم بجا لاتا رہتا۔ اس خوبصورت اردلی کو اپنا نوکر بنا دیکھ کر کرنل سبحان کو ایک خاص قسم کی تسکین ملتی۔ حسد سے جلتے دل کو قدرے قرار سا آ جاتا۔

''کیوں دوڑاتے ہیں بے چارے غریب کو اتنا۔۔۔۔۔۔ ایک منٹ بھی ٹک کر بیٹھنے نہیں دیتے۔'' کبھی کبھار بیگم اس پر ترس کھا کر کہہ اُٹھتیں تو بڑی نخوت سے جواب دیتے۔

''کیوں نہ کام لوں آخر؟ آرڈرلی ہے میرا۔۔۔۔۔۔ آرڈرلی کا مطلب سمجھتی ہو نا۔۔۔۔۔۔ آرڈر لینے والا۔ ویسے بھی ان سالوں سے کام نہ لو تو ان کی ہڈیوں میں پانی پڑ جاتا ہے۔'' وہ مطمئن ہو کر ٹانگیں پسار لیتے اور بت خوبرو کو اشارے سے بلاتے کہ آئے اور ان کے پاؤں دبائے۔

''انگریزوں نے یہ جاب ہمارے ہاں کے مقامی لوگوں کو غلام بنانے کے لیے ہی Create کی ہوگی۔'' بیگم صاحبہ نے ایک روز تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں مگر یہ جاہل ان پڑھ گنوار لوگ اسی قابل ہیں کہ انہیں خچروں کی طرح کام پر لگایا جائے۔ سالے کی شکل غور سے دیکھی ہے تم نے۔ اس کی نکڑ دادی یا نانی نے یقیناً سکندر اعظم کے سپاہیوں کے ساتھ راتیں گزاری ہوں گی۔'' کرنل سبحان نے کھی کھی کرتے ہوئے بیگم کو ایک غلیظ طریقے سے آنکھ ماری۔

بیگم کو ان کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ اس یوسف ثانی کے شہابی رنگ، باوقار چال ڈھال، مہذب لب و لہجہ دیکھ کر ان کا خواہ مخواہ ہی دل اس کی عزت کرنے کو چاہنے لگتا۔ انہیں یہ بہت کھلتا کہ کرنل سبحان اتنے نیک، پیبے، فرمانبردار اردلی سے خواہ مخواہ اتنی سختی سے کیوں پیش آتے ہیں۔ ہر وقت اسے اپنے فضول فضول سے کاموں میں اُلجھائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بار بار جوتے پالش کرواتے ہیں۔ وہ خاموش رہتیں مگر دل ہی دل میں کڑھتی رہتیں۔

بُت کو کرنل صاحب کی اطاعت اور خدمت کرتے دیکھتیں تو اس کی شرافت اور برداشت کی دل ہی دل میں اُسے داد دیتی رہتیں۔ اس کے ملکوتی حسن سے اتنی متاثر رہتیں کہ اسے اپنے لیے کوئی کام ہی نہ کہتیں۔ کرنل سبحان کے کالے کالے سوکھے پاؤں، وہ گورے گورے بھرے بھرے ہاتھوں سے دبتے دیکھنا انہیں بہت عجیب لگتا۔ ان کے شوہر اچھے تھے مگر شکل و صورت کے معاملے میں بس اللہ میاں کا بچہ ہی کہلائے جا سکتے تھے۔ سیاہی مائل گندمی رنگت، چھوٹی چھوٹی کشتی آنکھیں، درمیانہ قد، گنجا سر، چہرے پر خضاب رنگی مونچھیں۔ پہلے تو انہوں نے کبھی نوٹ نہ کی تھیں مگر اب نہ جانے کیوں تضاد میں سب کچھ بہت غیر مناسب سا لگنے لگا تھا۔

''نہ کریں نہ آپ کی مونچھیں مجھے چبھتی ہیں۔'' ایک بار کرنل سبحان نے بیگم کے لبوں کا رات گئے بوسہ لینا چاہا تو وہ بے اختیار تلملا اُٹھیں۔

''کیا مطلب؟ اب میری مونچھیں تمہیں چبھنے کیوں لگی ہیں؟ یہ کیا بات ہوئی بھلا؟'' وہ حیران سے ہو گئے۔

بیگم تڑپ کر ان کی آغوش سے علیحدہ ہو گئیں اور منہ پھیر کر خراٹے لینے شروع کر دیے۔ کرنل سبحان نے چند لمحے بیگم کی گرمجوشی کی واپسی کا انتظار کیا اور پھر خود بھی منہ لپیٹ کر نیند کی وادی میں اُتر گئے۔

انہیں گمان بھی نہ گزرا کہ بیگم نے تو بس یونہی آنکھیں موند رکھی تھیں۔ وہ کچھ ہی دیر میں اٹھ گئیں۔

شیشے کے آگے کھڑی ہو کر ایک عرصے بعد اپنے سراپا کا بغور جائزہ لینے لگیں۔ پینتالیس سال کی ہونے کو آئی تھیں مگر اب بھی جسم تنا اور پرکشش تھا۔ کرنل سبحان سے ایسے ہی نبھ رہی تھی جیسے عام طور پر شادیاں نبھا کرتی ہیں۔ نہ اونچ نہ نیچ، نہ گھاٹیاں نہ وادیاں، نہ جنگل نہ صحرا، نہ شور نہ سناٹا، راستہ سپاٹ تھا سفر بس طے ہوتا جا رہا تھا۔ زندگی کے بامعنی یا بے معنی ہونے سے کسی کو سروکار تھا نہ دلچسپی۔ دونوں ایک ہی ڈگر پہ گھسٹتے چلے جا رہے تھے کہ یکدم گھر میں ایک بُت مرمر ایک خوبصورت وجود چلتا پھرتا نظر آنے لگا تھا۔ اب اس کے حسن کے مقابلے میں ہر چیز اور ہر شخص کم صورت دکھائی دینے لگا تھا۔ بیگم صاحبہ نے اپنے جسم کی رعنائی پہ ہلکا سا فخر محسوس کیا مگر ساتھ ہی انہیں شدت سے احساس ہونے لگا کہ اس بدن کے صحرا پر مدت ہوئی ابر ٹوٹ کے نہ برسا تھا۔ ان کا ہم نفس، ہم قدم فوجی کب کا پسپا ہو چکا تھا اور فتوحات کے زمانے مدت ہوئی لد چکے تھے۔ مگر وہ خود کو ہاری ہوئی محسوس نہ کرتی تھیں۔ یوں جیسے منتظر تھیں کہ کوئی آئے اور آ کے انہیں ہرائے۔ انہیں پسپا کر دے، ڈھیر کر دے۔ مگر اب تو انہیں اپنے صحرائے حیات میں نہ کسی گھڑسوار کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی تھی نہ ہی اُڑتی ہوئی گرد کے بگولے دکھائی دیتے تھے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔

کرنل سبحان نے اگلی صبح اُس کو صرف اس بات پر زور سے تھپڑ جڑ دیا تھا کہ ان کے مطابق اس نے ان کے پالتو کتے شیرو کو کھانا دس منٹ لیٹ دیا تھا۔ تھپڑ اس قدر شدید اور آواز اتنی زیادہ تھی کہ راتب کھاتے شیرو نے بھی ایک بار تو منہ اُٹھا کر اس زور سے چیاؤں چیاؤں کی کہ لگا کسی نے اُسے ہی کس کر لات رسید کر دی ہو۔

بیگم نے بھی ٹوسٹ پر جیم لگاتے لگاتے ایک بار تو زور سے سی کر دی۔ انہیں نادر پر بہت ترس آیا۔ بے چارہ غریب نوکری کی وجہ سے کتنی ذلت برداشت کر رہا تھا۔ بعد میں انہوں نے کرنل سبحان کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کی تو کرنل صاحب کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

''بیگم آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔ اس طبقے کو زیادہ ہمدردی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے بس ایک تھپڑ ہی لگایا ہے۔ کرنل فخر الدین کا پتہ ہے نا وہ تو اپنی بیلٹ اُتار کر ان سالے اردلیوں کی پٹائی کر دیا کرتا ہے۔ فوجی لوگوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں تو پھر بھی بہت رحم دلی دکھاتا ہوں۔'' انہوں نے وضاحت پیش کی تو بیگم نے خاموشی سے موضوع ہی بدل دیا۔ وہ کہہ اور کر بھی کیا سکتی تھیں؟ اس روز انہوں نے لان میں واک کرتے اپنے دل میں اس کے کوارٹر کی طرف جانے کی خواہش شدت سے پیدا ہوتی محسوس کی۔ مگر وہ جھجک گئیں۔ ویسے بھی انہیں دور سے ہی نظر آ گیا تھا کہ بُت مرمر کوارٹر کے باہر پڑی چارپائی پر چت لیٹا آسمان کی طرف دیکھتا تھا اور آنسو اس کے گالوں کو بھگوتے جا رہے تھے۔

انہیں یک لخت اس پر پیار آ گیا۔ یوں جیسے وہ اس کی ماں ہوں اور وہ ان کا خوبصورت سا بچہ جس کا سر گود میں سہلا کر وہ اسے کسی پرسکون دنیا میں لے جانا چاہتی ہوں۔ اردلی کی نظریں بیگم صاحب سے جا ملیں تو وہ فوراً چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ گھر پر اس وقت کوئی نہ تھا۔ کرنل سبحان بھی شیرو کو لے کر لمبی واک پر نکلے ہوئے تھے۔

بیگم کے دل میں نہ جانے کیا آئی۔ باورچی خانے میں گئیں اور چائے کی ایک پیالی بنا کر اس بُت سوگوار کے آگے رکھ دی۔ وہ حیران سا ہو گیا۔

''نہیں جی بیگم صاحب...... یہ کیا کر رہی ہیں جی آپ؟ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ صاحب غصہ ہوں گے جی'' وہ بوکھلا کر بولتا چلا گیا۔

''کوئی بات نہیں۔ مت ڈرو، چائے پی لو، طبیعت بحال ہو جائے گی۔'' بیگم صاحب نے غیر اختیاری طور پر اس کی خوبصورت پیشانی کو چھو لیا۔ وہ ایک دم شانت سا ہو گیا اور نظریں جھکا کر جلدی جلدی چائے کے گرم گرم گھونٹ بھرنے لگا۔ اس کے ماتھے پہ پسینے کی بوندیں اور زیادہ نمودار ہونے لگیں۔

اس روز کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ بیگم صاحبہ اور اس بُت وجاہت کے درمیان خاموشی کی بات چیت شروع ہو گئی۔ نظریں ملتیں اور لب کھولے بغیر ہی کچھ نہ کچھ کہہ سن لیا جاتا۔ بیگم صاحبہ اس کی موجودگی میں خوامخواہ چہکنے لگتیں تو کرنل سبحان سمجھتے وہ ان کی کمپنی میں خوش ہو رہی ہیں اور اسی خوشی میں وہ بھی ہنستے مسکراتے بات بات پر اس پر حکم چلاتے۔ سر اور گردن کو مزید اکڑا لیتے۔

سر پر تیل مالش کرواتے کبھی کبھی اونگھ کر خراٹے لینے لگتے تو نادر خاں اور بیگم صاحبہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر چپکے سے مسکرا بھی دیتے۔ بیگم صاحبہ کو زندگی کچھ اچھی اچھی سی لگنے لگی تھی۔ وہ پہلے کتنی بور اور یکسانیت کا شکار تھیں۔ انہیں اب ہر وقت احساس رہنے لگا تھا۔ ایک بے کلی سی تھی جس میں چین اور سکون بھرا ہوا تھا۔

ایک روز عجیب واقعہ ہوا۔ کرنل صاحب نے اپنا جمعے کی نماز کا شلوار کرتہ نادر سے استری کروا کر کمرے کی الماری میں لٹکانے کو کہہ دیا اور خود کسی باہر سے آنے والی فون کال کو سننے کے لیے لان میں دور ایسی جگہ جا کھڑے ہوئے جہاں سے سگنل کیچ ہو رہے تھے۔ بُت فرمانبردار نے بیڈ روم میں ہولے سے

دستک دی اور کوئی جواب نہ ملنے پر آرام سے پٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ وہ کپڑے الماری میں لٹکانے کو پلٹا ہی تھا کہ یک دم ایک تیز مدھر خوشبو نے اسے مسحور سا کر دیا۔ بیگم صاحبہ نہا کر نکل آئی تھیں اور اب اپنے جسم پر پرفیوم چھڑک کر تولیے سے خود کو پونچھ رہی تھیں۔ وہ ایک دم گڑبڑا گیا اور دروازے کی طرف رُخ کر کے پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ بیگم نے اس کا راستہ روک لیا۔

کپڑے الماری میں لٹکا دو۔ انہوں نے اس کے ہاتھ سے ہینگر لے کر دوبارہ اسی کے حوالے کر دیا۔ اسی ایک لمحے میں انہوں نے لذت کے ایک جہان کی سیر کر لی۔ دونوں کے ہاتھ مس ہوئے تو جسموں میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔ بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں شراب سی بھر گئی۔ انہوں نے ذرا سی اوٹ کر کے قمیض پہن لی اور زپ بند کروانے کو اپنی ننگی کمر اس کے سامنے کر دی۔ کمر تھی کہ بجلیوں کا دمکتا ہوا سیلاب۔ وہ جلتا بھنتا زمین میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ بیگم نے اس کے ماتھے پہ آیا ہوا پسینہ اُنگلی سے صاف کر کے اپنی قمیض سے پونچھ دیا اور ہولے سے سرگوشی کی ''اے یوسف تجھے زپ بند کرنی نہیں آتی؟'' اس کے ساتھ ہی وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''مجھے معاف کر دیں بیگم صاحب جی...... غلطی ہو گئی۔'' کہہ کر بت مرمر فوراً جی اُٹھا اور باہر کو سرپٹ بھاگا۔ بیگم صاحبہ کے لبوں پر ایک مستانی سی مسکراہٹ کھل گئی۔

انہیں اس ہلکے پھلکے نازک رنگین سے واقعے نے حد درجہ محظوظ کیا تھا۔ کتنے عرصے بعد زندگی میں ایسا کوئی مزے دار لمحہ آیا تھا جب صنفِ مخالف کے کسی پرکشش مرد کی قربت انہیں ایک لمحہ کے لیے ہی سہی نصیب تو ہو گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں جھوم اٹھیں اور بقیہ کپڑے پہنتے گنگنانے لگیں۔ کرنل سبحان کی کال ختم ہو گئی تو وہ اپنے بیڈ روم کی طرف چل دیے۔ کاریڈور میں بدحواس بھاگتا اردلی نظر آیا تو کچھ اچنبھے میں پڑ گئے۔ پھر سوچا کمرے میں کپڑے ہی رکھنے گیا ہوگا۔ میں نے خود ہی تو اسے کہا تھا۔

''یہ...... ادھر کیا کر رہا تھا؟'' انہوں نے مشکوک انداز میں بیگم سے سوال کیا۔

''کون؟'' انہوں نے بھولپن سے پوچھا۔

''وہ...... آیا تھا ادھر؟'' انہوں نے ایک بار پھر پوچھا۔

''یہاں کس نے آنا ہے؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' کرنل سبحان نے پھر بیگم کی طرف دیکھا جو بے چاری خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی کمر کی زپ بند کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ابھی ابھی رونما ہونے والے حسین اتفاق کی وجہ سے ان کے ہاتھ اُلٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔ مگر انہوں نے اپنے شوہر پہ کچھ ظاہر نہ کیا۔

"Let me help you" کرنل صاحب نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کرنے کی آفر کی۔

''نہیں میں کر لوں گی۔'' بیگم نے رُکھائی سے جواب دیا اور خود زپ بند کر کے بالوں میں کنگھا پھیرنے لگیں۔

''کس وقت آیا تھا وہ؟'' نہ جانے کیوں کرنل صاحب کو کچھ بے چینی سی ہونے لگی۔ کہیں اس نے کسی ایسے غلط وقت میں تو بیڈ روم میں قدم نہیں رکھ دیا جب...... اس سے آگے وہ سوچنا نہ چاہتے تھے مگر طبیعت میں عجیب سی بے چینی سی بھر گئی تھی۔

انہوں نے اچانک بیڈ روم کی چٹخنی لگا کر پیار بھرے انداز میں بیگم کو اپنی طرف ہولے سے کھینچا۔

''بڑی پیاری لگ رہی ہو سویٹ ہارٹ......'' وہ سرگوشیاں کرنے لگے۔

''نہیں نا...... مجھے پارٹی میں جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے...... شیریں انتظار کر رہی ہوگی۔'' اس نے انہیں پیچھے دھکیلتے ہوئے اپنی دوست شیریں کے ہاں جانے کا یاد دلایا۔

''بھئی آدھے گھنٹے لیٹ چلی جانا...... جلدی کیا ہے۔'' کرنل صاحب نے اپنے آپ کو بیگم سے چھوڑتے ہوئے کہا۔

''چھوڑیں...... آدھے گھنٹے کی بات تھوڑا ہی ہے۔ کئی گھنٹے ضائع ہو جائیں گے۔''

بیگم نے کرنل صاحب کو یاد کروا دیا کہ وہ اب ایک تھکا ہارا، پسپا پرانا سپاہی ہیں۔ میدان جیتنا ان کے لیے اتنا آسان نہیں رہا جتنا پہلے ہوا کرتا تھا۔ سپاہی نے ہتھیار پھینک دیے اور خاموشی سے ٹی وی آن کر دیا۔

بیگم تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئیں تو کرنل سبحان بستر پر پڑے کڑھتے رہے۔ کہیں وہ باسٹرڈ...... ان کے دماغ کی سوئی بار بار اٹکنے لگی۔ مگر وہ اس خیال کو ناممکن سمجھ کر ٹالتے رہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک اردلی کی اتنی جرأت کیسے ہو سکتی ہے۔ نہیں نہیں۔ مجھے یونہی وہم ہونے لگا ہے۔

اس روز کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ کرنل صاحب نے اس پر حد سے زیادہ سختی اور ظلم کرنا شروع کر دیا۔ بات بے بات انہیں اس پر غصہ آتا تو وہ اسے جھڑکتے اور ذلیل کرنے لگتے۔ ایک روز تو حد ہی ہو گئی۔ بیگم باہر گئی ہوئی تھیں۔ ان کے گھر میں گھستے ہی انہوں نے بیلٹ اُتار لی اور اسے بے دردی سے مارنا شروع کر دیا۔ اس کا قصور بہت ناقابل معافی تھا۔ وہ فروٹ منڈی سے صبح سویرے جو تربوز لایا تھا وہ مکمل طور پر سرخ نہیں بلکہ اندر سے سفید نکلا تھا۔

''تجھے سودا صحیح لانے کی تمیز نہیں ہے؟ نالائق...... میرے پیسے ضائع کروادیے تو نے......'' وہ اسے دھنا دھن پیٹ رہے تھے اور بکتے جارہے تھے۔

''نہ ظلم کریں اس بے چارے پر......'' بیگم صاحبہ زبان پر قابو نہ رکھ سکیں اور بیچ میں بول پڑیں۔ بُتِ مظلوم کو بچانے کے لیے انہوں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا تو اس پر بھی ایک ضرب لگی۔

''پاگل ہوئی ہو۔ ہاتھ پیچھے ہٹاؤ اپنا۔ اس بے شرم کو میں سبق سکھا کر رہوں گا۔ آج کے بعد اسے ہمیشہ یاد رہے گا کہ تربوز کے اندر کا رنگ کیسا ہونا چاہیے؟'' انہوں نے زور سے اپنی بیلٹ کو گھما کر بت مجبور کی کمر کے گرد چوٹ لگائی۔

وہ تڑپ کر بولا ''مجھے معاف کردیں۔''

''صاحب جی...... مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ اندر سے لال نہیں ہے۔ دکاندار نے گارنٹی دی تھی۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔'' یہ سن کر کرنل سبحان کے ہاتھوں میں اور طاقت بھرتی چلی گئی۔ اس واقعے کے بعد وہ بالکل خاموش رہنے لگا۔ اب اس نے بیگم صاحبہ سے نظریں ملانا بھی چھوڑ دی تھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ نوکر ذات ہے۔ اسے اپنی حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ بس کسی طرح سے میری نوکری بچی رہے۔ یہ سوچ کر وہ خود کو سمجھا بجھا کر بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ بیگم صاحبہ کو لگا جیسے وہ اس سے ناراض ہوگیا ہو۔ وہ اکثر اس کی بلوری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتیں مگر وہ اپنی نگاہیں اوپر ہی نہ اُٹھاتا۔ گھر میں عجیب اُداسی اور بے زاری کی فضا قائم ہوگئی تھی۔ وہ سوچنے لگیں پھیکے پھیکے رنگوں کی خوبصورت دھنک، ایک بار بھولی بھٹکی ان کے دل کے ویران آسمان پر اُبھری تو تھی مگر اب پھر تپتی دھوپوں کا موسم چلا آیا تھا۔

صبح اخبار پڑھتے ہوئے بیگم صاحبہ نے کرنل سبحان کے سامنے ہی اسے پہلی بار اپنے کپڑے استری کرنے کو کہا تو وہ سر جھکا کر ''جی بیگم صاحبہ'' کہہ کر ان کے کپڑے اُٹھا کر چلا گیا۔ کرنل صاحب کا یکبارگی تو خون کھول اُٹھا مگر وہ اس کے سامنے بیگم کو کچھ کہنا نہ چاہتے تھے۔ مگر انہیں رہ رہ کر یہی خیال آتا رہا کہ اس نابنجار دو ٹکے کے اردلی کو میری بیوی کا کام کرنا، اس کے خوبصورت کپڑے استری کرنا کتنا اچھا لگ رہا ہوگا۔ ان باریک ملائم مہین کپڑوں پر ہاتھ پھیرتا وہ نہ جانے کیا سوچ رہا ہوگا...... کہاں کہاں جا پہنچ رہے ہوں گے اس خنزیر کے خیالات۔

یہ سب سوچتے سوچتے کرنل صاحب کو از حد وحشت ہونے لگی۔ وہ گھبرا کر سوچنے لگے یہ سالا تو مجھے نفسیاتی مریض بنا دے گا۔ اسے واپس رجمنٹ بھجواتا ہوں اور کوئی اور اردلی منگواتا ہوں۔ انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ اب وہ جلد ہی اسے فارغ کر دیں گے۔

اگلے روز نہ جانے کیا ہوا۔ وہ پھر وہی غلطی کر بیٹا۔ منڈی سے تربوز لایا اور چپکے سے بیگم صاحبہ کے آگے رکھ دیا۔ چھری اور بڑی سی ٹرے بھی پاس ہی رکھ دی۔ اس روز اس نے سیاہ کرتہ شلوار پہن رکھا تھا جس میں اس کی مردانہ وجاہت مکمل طور پر نکھر کے سامنے آ رہی تھی۔ ''ماشاءاللہ'' بیگم نے اسے دیکھتے ہوئے زیر لب کہا اور تربوز کاٹتے کاٹتے نہ جانے کیسے اپنی اُنگلی کاٹ بیٹھیں۔

''بی بی آپ کا دھیان ہے کدھر آخر؟'' کرنل صاحب نے اُنگلی سے خون کی پتلی سی لکیر پھوٹتی دیکھی تو چیخ کر بولے۔

ساتھ ہی ان کی نگاہ کٹے ہوئے تربوز پر جا پڑی۔

''اوئے بیوقوف، جاہل، بے عقل، آج پھر ویسا ہی تربوز اُٹھالایا ہے؟'' انہوں نے سفیدی مائل کچے تربوز کو ہوا میں بلند کرکے زور سے کہا۔

''او باسٹرڈ! تجھے کوئی عقل بھی ہے یا نہیں؟'' وہ غرائے۔ اردلی اپنی جگہ سے یوں اُچھلا جیسے اسے کسی بھڑ نے کاٹ لیا ہو۔

''کرنل صاحب جی...... مجھے یہ گالی نہ دیں۔'' وہ بھی جواباً چیخا۔ میجروں، کرنیلوں کے درمیان رہتے رہتے اُسے اس گالی کا مطلب اچھی طرح پتہ چل گیا تھا۔

''گالی نہ دوں باسٹرڈ؟ میں تو تیری چمڑی اُدھیڑ دوں گا۔ پھر سفید تربوز اُٹھالایا ہے۔'' کرنل سبحان نے اپنی چمڑے کی بیلٹ کھول لی۔

''معاف کردیں جی مجھے پتہ نہیں تھا کہ تربوز کتنا لال ہونا چاہیے۔'' وہ منت کرنے لگا۔

''تربوز اتنا سفید بھی نہیں۔ یہ دیکھیں گلابی سا تو ہے۔'' بیگم صاحبہ بے چین ہو کر بولیں۔ نہ جانے کیوں ان کا دل بے طرح گھبرانے لگا تھا۔

''گلابی نہیں لال ہونا چاہیے...... لال''......

کرنل صاحب نے بیلٹ گھما کر زور سے اردلی کو مارنا شروع کردیا۔ ان کے منہ سے مغلظات بھی جاری ہو گئیں۔ پھر نہ جانے کیا ہوا...... بُتِ منجمد کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے پھرتی سے ایک زقند بھری اور میز پر پڑی چھری کرنل کے بڑے سے پھولے ہوئے پیٹ میں گھونپ دی۔ سرخ سرخ خون کا فوارہ اُبلا اور زمین پر گر کے لکیریں بنانے لگا۔

''زلیخا......'' کرنل سبحان کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔

''کیوں کرنل صاحب...... تربوز کو اتنا لال ہونا چاہیے...... بتایئے کرنل صاحب۔ اندر کا یہ رنگ ٹھیک ہے نا......؟'' وہ ہذیانی کیفیت میں چیختا اور وار کرتا چلا گیا۔

نرگس بیمار

شبہ طراز

ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں چھ نفوس کی موجودگی کی وجہ سے کمرہ بھرا بھرا لگ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنیوں اور ملی جلی آوازوں کے ارتعاش سے کمرے میں رونق کی لہریں چائے کے برتنوں سے ٹکرا کر کھنکھنا رہی تھیں۔ جیسے گویا کھلکھلا کر ہنس رہی ہوں۔

اتنی دیر میں جتنی دیر میں مسز آغا کچن سے ٹرے لینے گئیں اور واپس آئیں، کمرے کا نقشہ بدل چکا تھا۔ آغا صاحب کی تیوری پر ناگوار بلوں کی ابھرتی مٹتی لکیروں سے معاملے کی گتھی سلجھنے میں اتنی مدد نہیں مل رہی تھی۔ مہمان آئے ہوئے سید صاحب نسبتاً اونچی آواز میں آغا صاحب سے مخاطب تھے اور آغا صاحب کی بیٹی جوان کی ہونے والی ممکنہ بہو تھی، کی شکایت کر رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ اس سے پہلے کیا کہہ چکے تھے لیکن جب مسز آغا کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ کہہ رہے تھے کہ لیہہ نے انہیں تین مہینے سے سلام بھی نہیں کیا۔

وہ دونوں خاندان بظاہر پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے افراد پر مشتمل تھے۔ دو بیٹے سید صاحب کے اور دو بیٹیاں آغا صاحب کی تھیں۔ شہر کی نامور یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کر کے سب بچے اچھے روزگاروں کے ساتھ منسلک تھے۔ آغا صاحب کی بیٹی اور سید صاحب کا بیٹا ایک ہی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے اور یہ رشتہ ان بچوں کی پسندیدگی ہی کی وجہ سے وجود میں آیا تھا اور دونوں خاندانوں نے رسمی پیش رفت کے بعد آمادگی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ حالانکہ آغا صاحب کو پہلی نظر میں سید صاحب کے بیٹے ہارون میں کچھ ایب نارمل رویے کی جھلک محسوس ہوئی تھی لیکن مسز آغا کے سمجھانے اور اپنی بیٹی کے پر اعتماد والہانہ پن کے نتیجے میں وہ آخر خاموش ہو گئے تھے۔ لیہہ دھن کی پکی اور اپنے شعبے میں ماہر ہونے کے علاوہ بہت پر عزم لڑکی تھی۔ وہ زندگی میں بہت کچھ کرنے کی خواہاں تھی اور اس کے کہنے کے مطابق ہارون میں اپنے بچپن کی کچھ محرومیوں اور خوف کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے نفسیاتی مسائل تھے جنہیں وہ اپنے تئیں خوش اسلوبی سے سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کھانے کی میز پر مختلف موضوعات پر بحث کرنا ان کے گھر کی روایت تھی۔ آزادیٔ خیال اور آزادیٔ رائے کی فضا خود مسز آغا نے بنائی ہوئی تھی۔ آغا صاحب کو ان کے پرانے روایتی خاندان سے الگ کر کے مسز آغا نے رفتہ رفتہ اعلیٰ اخلاقی اور کھلے ڈُلے معاشرتی و سماجی اصول اپنے گھر میں لاگو کر دیے تھے۔

گو آغا صاحب اپنے روایتی رسوم و رواج کو خیر آباد کہہ کر بیگم کے رنگ میں ڈھل چکے تھے۔ پھر بھی نماز روزہ ان کے نزدیک اہم فریضہ تھا اور وہ کسی حد تک یہ فرائض ادا کرنے میں چوکتے نہیں تھے۔

رشتہ طے ہونے کے کچھ عرصہ بعد تک تو مسز آغا لیہہ کے چہرے پر رومانوی سرخی کے آثار محسوس کرتی رہی تھیں لیکن رفتہ رفتہ اس سرخی نے زردی میں بدلنا شروع کیا تو انہیں تشویش ہوئی اور پھر ایک دن کھانے کی میز پر پہلی مرتبہ لیہہ نے ہارون کے بارے میں فکرمندی کا اظہار کیا تھا۔ Narcissims کا نام تو انہوں نے سن رکھا تھا اور شاعری سے لگاؤ ہونے کی وجہ سے انہیں شاعری اور نرگسیت اکثر ساتھ ساتھ سنائی دے جاتے تھے۔ پر وہ نرگسیت کو رومانوی معنوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ ان کے خیال میں نرگس کا پھول بس ایک خوب صورت نہ ختم ہونے والے انتظار کی علامات تھا اور لیہہ جو اکثر بحثوں میں پرانے کلاسیکل شعراء کو خود رحمی کا شکار اور جدید شعراء کی ایک فہرست کو Hippocrates کہتی تھی اور ایک مرتبہ تو اس نے Narcissism پر پورا لیکچر ہی دے ڈالا تھا اور بتایا تھا کہ ہماری بے چاری نرگسیت دنیا بھر میں باقاعدہ ایک بیماری کے طور پر مانی جاتی ہے۔ اس بیماری میں مبتلا شخص اپنے ساتھی کو ہمیشہ عدم تحفظ کا شکار رکھتا ہے اور اس کی شخصیت کو کچل کر مطمئن ہوتا ہے۔ کبھی بہت خوش اور کبھی از حد رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ شدید غصہ کی صورت میں اپنے ساتھی کو مارنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ حاسد اور بے انتہا خود پسند و خود پرست ہوتا ہے اور اس میں یہ سب علامات اپنی انتہائی حد میں موجود ہوتی ہیں اور اس بیماری پر تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ ہارون کی Bipolar شخصیت میں Narcissistic disorder behaviour کی علامات اس نے نہ صرف محسوس کی تھیں بلکہ وقتاً فوقتاً ان کا تجربہ بھی کر لیا تھا۔ جب وہ اپنے ساتھ ہونے والے تجربات ماں کے ساتھ شیئر کرتی تو مسز آغا اپنے ماضی کی کسی پاتال میں اتر جائیں۔ انہیں اپنی شادی

سے یہاں تک کا سفر باب در باب نظر آنے لگتا۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے سماجی اور معاشرتی طرز زندگی کا شاخسانہ بتاتے ہوئے لبیبہ کو سمجھانے کی کوشش کرتیں اور بتاتیں کہ دراصل بہت عرصے تک ہندوؤں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے بہت سے رسوم و رواج مشترک ہوگئے ہیں۔ ہم بھی لڑکیوں کو واپس مڑ کر نہ دیکھنے اور برے سے برے حال میں سمجھوتہ کرنے کا کہہ کر بھیجتے ہیں اور اس کی سوچ پختہ ہونے سے پہلے شادی کر دیتے ہیں تاکہ وہ ہر حال میں خوش رہے یا کم از کم خوش دکھائی دے۔ حالانکہ اسلام لڑکی کی رضامندی کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتا ہے جتنی لڑکے کی مرضی کو دی جاتی ہے لیکن لبیبہ اختلاف کرتے ہوئے ہمیشہ یہی کہتی کہ پھر ہندوؤں پر بھی تو مسلمانوں کی تہذیب کے اثرات نظر آنے چاہئیں اور یوں بحث کسی اگلے وقت پر چھوڑ دی جاتی۔

مسز آغا اکثر ذکر کرتیں کہ بیٹا ہم سے پچھلی نسل نے ہم سے بھی زیادہ سہا ہے اور بہت سی آرزوؤں کی قربانیاں دی ہیں۔ پھر ہماری نسل نے بہت سے اصول توڑے بہت سے بدلے۔ وہ کہتیں یہ سماجی تبدیلی دراصل ایک سست رو ضابطۂ عمل ہے اور پھر ہمارے ہاں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے عیب ڈھونڈنے کا رواج ہے اور شادی سے پہلے کسی تربیت یا بعد میں پیش آنے والی کسی مصیبت سے نمٹنے کی کوئی ترکیب کہیں نہیں ملتی۔ بس صبر کے آٹے میں گندھی زندگی کی روٹی پکاتے پکاتے عورت کے ہاتھوں میں آبلے پڑ جاتے ہیں اور سماج عورت سے سمجھوتے کے علاوہ کچھ نہیں چاہتا لیکن وہ بھول جاتیں کہ اب آنے والی نسل کس حد تک تعلیم یافتہ ہے اور دنیا کے گلوب میں اب کوئی بھی معلومات اور تربیت حاصل کرنا بس ایک بٹن دبانے کی دوری پر موجود ہے۔ کتنی مددگار ''ہیلپ لائنز'' وجود رکھتی ہیں جہاں دنیا بھر کے انسان اپنے احساسات، جذبات اور تجربات پر ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ کتنے بحث و مباحثہ کے ''فورم کی بورڈ کے'' ٹھکا ٹھک کے اندر چھپے ہیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی اور سسرالی چترائیوں کو جو گر سیکھنے میں ان کے تیس سال بھسم ہوگئے اور نتیجے تک پہنچتے پہنچتے ان کے بال سفید اور دل پژمردہ ہوگیا وہ سچائیاں لبیبہ پہلے سے معلوم کر کے اپنی زندگی کا فیصلہ کرے گی۔ وہ خوش تھیں پھر بھی وہ ایک بیمار سماج میں زندگی بسر کر رہی تھیں اور وقت بے وقت ایک انہونے دباؤ سے دوچار ہوجاتی تھیں۔ اسی لیے دو ایک مہینے سے تو وہ خود ہر نماز کے بعد ایک مخصوص دعا پڑھ رہی تھیں جو انہیں ایک ٹی وی پروگرام دیکھتے ہوئے سننے کو ملی تھی، جس میں ایک مشہور عالم دین یقین دلا رہے تھے کہ مسلسل یہ دعا پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے خضوع وخشوع کے ساتھ اپنی جسمانی اور نفسانی بیماریوں کا نام لے کر ان سے نجات کی التجا کی جائے تو چالیس دنوں میں آپ شفاف ہونے کا مشاہدہ کریں گے اور تب سے مسز آغا اپنے گٹھیا، اعصاب اور یادداشت کے ساتھ ساتھ ریاکاری، غصہ، حسد اور غرور سے بچنے کی خصوصی دعا بھی کر رہی تھیں......

......سید صاحب کی بات سنتے سنتے مسز آغا کمرے میں داخل ہوئیں اور کمرے کی بوجھل فضا کو تبدیل کرنے کی خواہش کے ساتھ کہا کہ سید صاحب ہارون نے خود لبیبہ کو منع کیا تھا کہ آپ سے سلام دعا نہ لے۔ وہ شاید آپ سے لڑا ہوا تھا۔ ہم تو خود اس کے اس رویے سے حیران اور قدرے پریشان تھے۔ سید صاحب نے بیٹے سے ناراضی کا اقرار کرتے ہوئے پھر اسی بات پر زور دیا اور بولے جیسے پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں اسی طرح بہو کا منہ گھونگھٹ میں نظر آجاتا ہے۔ مسز آغا نے بھی برجستہ جواب دیا کہ اب وہ گھونگھٹ کہاں سید صاحب، ہمارے بچے ہوش مند ہیں اور انہیں اپنی حدیں مقرر کرنا آتی ہیں اور پھر چند دن پہلے جب آپ کی ہارون سے دوستی ہو گئی تھی لبیبہ نے اسی دن آپ سے سلام دعا کی تھی اور وہ بہت خوش تھی۔ اس بحث کے دوران مسز سید بالکل خاموش بیٹھی تھیں لیکن ان کے ہونٹوں کے کونوں کی دبی دبی نامعلوم مسکراہٹ، ہارون کی اضطرابی کیفیت اور آغا صاحب کے چہرے کا کربناک تاثر اچانک حیرت میں تبدیل ہوگیا جب لبیبہ نے مسز سید سے پوچھا کہ آنٹی آپ کا اس سارے سلسلے میں کیا خیال ہے...... اور اس کا پوچھنا جیسے ایک قیامت ہوگیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ تو اس رشتے کے شروع سے خلاف تھیں۔ ان کے کہنے کے مطابق ان کا بیٹا نادان تھا اور لبیبہ اس کی ترقی میں ایک رکاوٹ بن کر آ گئی تھی بلکہ شاید اسے اس رشتے پر مجبور کر دیا تھا اور ان کے مطابق لبیبہ ان سے ان کا بیٹا چھین رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ لڑکی کو بہر حال سسرال کے سامنے جھکنا ہی چاہیے اور اگر وہ جھک نہیں سکتی تو رشتے کو بگڑنے سے پہلے ختم کر دینا چاہیے۔ حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ انہوں نے بڑی جدوجہد سے یہ سارا جال

بھجایا تھا۔ انہوں نے جان بوجھ کر باپ اور بیٹے میں لڑائی کروائی تھی۔ تاکہ ایبہ کی براہِ راست سید صاحب سے بات ہی نہ ہو۔ انہیں معلوم تھا کہ ہارون کے Mood swings کی اصل وجہ ان کی لیٹ میرج کے نتیجے میں میاں سے نہ ہونے والی محبت اور ہارون کے بچپن میں ان کی میاں سے ہر وقت کی لڑائی اور چخ چخ ہے اور ان کے Manipulative behaviour اور ہارون کے تربیت کے اہم دنوں میں ان کی نوکری پر چلے جانے کی وجہ سے بچپن ہی سے ہارون میں تشدد اور حسد کے جذبات بھر گئے تھے اور ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے اس کا علاج بیچ ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ گھر کی پوری بساط ان کے ہاتھ میں تھی۔ انہیں مہروں کو استعمال کرنے کا ہنر آتا تھا۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ جب بھی ایبہ ان کے لیے کوئی تحفہ یا پھول لے کر آتی تھی وہ کبھی تھیلا کھول کر بھی نہ دیکھتی تھیں اور پھول تو رکھے رکھے ہی سوکھ جاتے تھے اور ایبہ کو اگلے وزٹ پر وہیں پڑے ملتے جہاں وہ چھوڑ کر آئی ہوتی تھی اور سید صاحب کو ان تحفوں کے آنے کی خبر ہی نہ ملتی۔ ویسے بھی وہ اکثر اپنے کمرے میں منہ پھلائے پڑے ہوتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ ایبہ اور ہارون کس کیفے میں کتنی مرتبہ چائے یا کافی پیتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہمہ وقت ہارون سے رابطے میں رہتیں اور بظاہر اس کے لیے فکر مند ہوتیں۔ یہاں تک کہ انہیں ہارون کے فون کالز اور برقی پیغامات کی تعداد بھی معلوم تھی۔ کیونکہ گھر کے تمام فون پوسٹ پیڈ تھے اور مسز سید کے نام تھے اور مسز سید خود ایک بینک میں ملازم رہی تھیں اور ان کا بینک اکاؤنٹ فکس اور پراپرٹی ان کے اپنے نام تھی اور سید ارژنگ صاحب ساری عمر اپنے آباؤ اجداد کی عظمت کے گن گاتے ہوئے کچھ بھی نہ کرتے رہے تھے اور ہر آنے والے کو اپنی جوانی کے بے مہار قصے سنا سنا کر اپنی گردن اکڑا لیا کرتے تھے.....

.....اور پھر اس ناخوشگوار دن کا خاتمہ ہو گیا۔

سید صاحب کی فیملی جا چکی تھی۔ میز پر بحث کے بہت سارے باب کھل چکے تھے۔ بہت ساری باتوں نے ابھی ہونا تھا۔ بہت سے معاملات طے ہونے سے رہ گئے تھے۔ بہت سے رشتوں میں دراڑ پڑ چکی تھی۔ دل ٹوٹ گئے تھے پھر بھی بظاہر سب کچھ پرسکون تھا اور تین چار دن کے بعد عین اُس وقت جب مسز آغا اپنے کمپیوٹر میں Marlee کی ویب سائٹ دیکھ رہی تھیں اور اس میں کمنٹس کے خانے میں لکھ رہی تھیں کہ ڈیئر مارلی! تمہارا شکریہ کہ تم نے میری بیٹی کی زندگی بچالی۔ مارلی ہمارے ملک میں Narcissism کی بیماری اتنی عام ہے اور یہ افراد کی بجائے پورے کے پورے خاندان میں موجود ہوتی ہے اور ہمارے Narcissist والدین اپنے بچوں کو ایک اور Narcissist disorder person کے حوالے کر دیتے ہیں اور یہ نہ ختم ہونے والی کہانی نسل در نسل جاری رہتی ہے اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ وہ یہ جانتے بھی نہیں اور جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ وہ کس بیماری کا شکار ہیں اور اس طرح ہم نے ایک بیمار سماج تشکیل دے لیا ہے جس میں ہم بے یارو مددگار جی رہے ہیں۔ تمہارے آرٹیکل اور بلاگ پڑھ کر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم لوگ کیوں ترقی یافتہ قوموں میں شمار ہوتے ہو۔ تم لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو، اسی لیے تم اپنی جنت تخلیق کر چکے ہو۔

اپنی کربناک زندگی گزارنے کے باوجود میں تمہاری احسان مند ہوں کہ تم نے میری بیٹی کو تباہ ہونے اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو زنگ لگنے سے بچالیا۔ اللہ تمہیں ہمت عطا کرے۔

عین اُسی وقت آغا صاحب جاء نماز پر بیٹھے نہایت خضوع وخشوع کے ساتھ کوئی دعا پڑھ رہے تھے جو شاید انہوں نے ٹی وی پر سنی تھی۔ مسز آغا نے کمپیوٹر بند کر کے ہولے سے ایبہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر سر ٹکائے ٹکائے سوگئی تھی اور کمپیوٹر پر ہلکی آواز میں ریحانہ کا گانا بج رہا تھا۔ Shine bright like a diamond اور مسز آغا مسکرا کر دبے پاؤں اپنے بیڈ روم کی طرف چل پڑیں۔

تازہ شعری مجموعہ

جنگل، جھیل اور میں

شاعرہ

نیلما ناہید درانی

صفحات: 144 قیمت: 400

ناشر:

نستعلیق مطبوعات

فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

خاکدان

ایوب صابر

شہر کے مضافات میں یہ کچی بستی خودرو جھاڑیوں کی طرح اُگ رہی تھی۔ روز بروز بستی کے مکینوں کی میں تعداد اضافہ ہو رہا تھا۔ بے گھر افراد سر چھپانے کے لئے شہر کی گہما گہمی سے بھاگ کر بھیڑوں کی طرح منہ اٹھائے یہاں چلے آتے تھے۔ اسی وجہ سے اِس بستی کا نام ''بھیڑ چال'' رکھ دیا گیا۔ کسی نے شہر میں تعمیر ہونے والی جدید عمارتوں سے اینٹیں چُرا کر اُپلوں کے تال کے برابر کمرہ بنالیا تو کوئی جھونپڑی کو ہی تاج محل سمجھ کر بسیرا کر رہا تھا اور کوئی تمبو گاڑھ کر خود کو محفوظ پناہ گاہ کا مکین تصور کر رہا تھا۔ سرکاری زمین پر آباد اس بستی کے مکین جانتے تھے کہ انہیں کسی بھی وقت اپنا گھر چھوڑ کر کھلے آسمان تلے رہنا پڑے گا۔ ایسی بستیاں باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت قائم نہیں ہوتیں، جس طرف دل چاہا گھر بنالیا۔

بستی میں داخل ہونے والوں پر نظر رکھنے کے لئے کتے اِدھر اُدھر بیٹھے اونگھ رہے ہوتے تھے۔ جونہی کوئی انسان دیکھا وہیں دُم ہلاتے ہوئے کھڑے ہو جاتے، ان میں ایک کتا ''بھوں'' کی آواز نکالتا تو دوسرے کتے بھی راگ راگنیاں چھیڑ دیتے۔ اس طرح بستی میں راگ کتیاری کورس کے ساتھ شروع ہو جاتا۔

''آج اگر تو پورے 20 روپے کما کر نہیں لایا تو شام کو گھر آنے کی ضرورت نہیں، وہیں کچرا کنڈی میں سو جانا۔'' جیدے کی سوتیلی ماں نجو نے ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے حکم صادر کیا۔

''ماں! میں سارا دن کچرا چنتا ہوں لیکن دُکاندار 15 / 12 روپے دے کر ٹرخا دیتا ہے۔'' جیدے نے وضاحت پیش کی۔

''میں کچھ نہیں جانتی، مجھے پورے پیسے لا کر دو، تمھارا باپ کوئی خزانہ چھوڑ کر نہیں مرا تھا جو میں وہاں سے نکال کر خرچ کروں۔'' نجو نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

وہ اِس قدر غصے میں تھی کہ پان کی پچکاری بھی کونے میں مارنے کی بجائے اپنی شلوار کے پائنچے پر ڈال دی۔ وہ جب منہ کھولتی تو اُس کے پان زدہ دانت اور بھی بھدے لگتے۔

''ٹھیک ہے ماں، میں آج کسی بھی طرح 20 روپے لے کر ہی گھر آؤں گا تُو شام کو میرا انتظار کرنا۔'' جیدے نے ہتھیار پھینک دیے۔

جیدا بھی کیا قسمت کا مارا نکلا، ابھی ایک سال کا تھا جب اُس کی ماں شادو کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر ابدی نیند سوگئی۔ اُس کے بعد جیدے کے والد غفورے نے گھر کا چولہا جلانے کے لئے نجو سے دوسری شادی کر لی تا کہ جیدے کی بھی پرورش ہو سکے۔ غفورا گدھا ریڑھی چلاتا تھا، وہ کیسے گھر بیٹھ کر بچے کے ساتھ وقت گزار سکتا تھا۔ نجو سے شادی کر کے غفورا بے فکر ہوگیا کہ اُس کا گھر پھر سے آباد ہوگیا۔ نجو بھی ایسی گھوڑی کہ اُس نے ایک دفعہ بھی جیدے کو پیار کی نظر سے نہیں دیکھا۔

ابھی جیدا پانچ سال کا ہوا تھا کہ ایک دن غفورا اپنی ریڑھی پر جا رہا تھا، بجلی کا تار ٹوٹ کر اُس پر گرا اور کرنٹ لگنے سے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ گھر میں پہلے ہی غربی کی حکومت تھی، اب گھر کا واحد کفیل بھی قبرستان کا مکین بن چکا تھا۔ نجو نے ایک بنگلے میں صفائی کرنے کا کام شروع کر دیا، پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے کچھ تو ایندھن کی ضرورت تھی۔ جیدے کو پڑھنے کا شوق تھا لیکن نجو جانتی تھی کہ اگر جیدا اسکول جانے لگا تو وردی اور کتابوں پر خرچ ہوگا، اِس لئے بہتر ہے اُسے پڑھائی سے دور رکھا جائے۔ اسی طرح مزید تین سال کا عرصہ گزر گیا۔

31 دسمبر کی رات ملک بھر میں لوگ اپنے اپنے انداز میں سال کو الوداع کہہ رہے تھے، شہر کے باسی اس طرح خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ رات کو دن کا سماں تھا۔ سڑکوں پر گہما گہمی اور لوگ ہوٹلوں کا رخ کر رہے تھے تا کہ سال کی آخری رات کو یادگار انداز میں منایا جائے۔ کچھ لوگوں نے گھروں پر چراغاں بھی کیا تھا۔ جیدا اور اُس کی ماں اپنی بستی میں سردی سے بچنے کے لئے لحاف کے اندر گھسے ہوئے تھے۔ اُن کے لئے سال کے سارے دن ایک جیسے تھے۔

یکم جنوری کی صبح سردی بھی معمول سے زیادہ تھی۔ جیدا اٹھ کر باہر نکلا تو کہرے نے ہر سُو ایسی چادر تان رکھی کہ حدِ نگاہ بالکل کم رہ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ زمین پر آٹے کی ہلکی تہہ جم گئی ہو۔ اس عالم میں ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیاں گویا جسم کا حصہ ہی نہیں اور سانس لینے پر بھاپ منہ کے اندر سے نکل رہی تھی۔ اس برفیلے موسم میں پرندے بھی اپنے گھونسلوں میں دبک کر بیٹھے تھے۔ جیدا سوچ رہا تھا کہ سال کا یہ پہلا دن میرے لئے کیا خوشی لایا؟۔ یہی

سوچتے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوا۔

اُس کی ماں نجو نے رات کی باسی روٹی گرم کر کے چٹنی کے ساتھ دی۔ جیدے نے روٹی کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا جس نے پیٹ بھرنے کا انتظام کر دیا۔ نجو نے ہاتھ میں پکڑی کھاد کی خالی بوری جیدے کو دے دی۔

''جیدے! اب تُو آٹھ سال کا ہو گیا ہے، تُو بھی اپنے محلے دار شیدے کے ساتھ کچرا چننے جائے گا۔'' نجو نے غصے سے جیدے کو کہا۔

''اماں! ابّا تو کہتا تھا کہ تُو پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننا۔'' جیدے نے ماں کو یاد دلایا۔

''وہ خود تو قبر میں چلا گیا اور تجھے زبان چلانے کے لئے میرے پاس چھوڑ گیا۔'' نجو نے اندر کا سارا زہر نکال دیا۔

''ٹھیک ہے ماں، اگر تیری یہی مرضی ہے تو میں شیدے کے ساتھ کچرا چننے چلا جاتا ہوں۔'' جیدے نے سر جھکا کے کہا۔

آج سال کا پہلا دن تھا اور جیدے کو جس کاندھے پر اسکول بیگ اٹھانے کی خواہش تھی اُس پر کچرا ڈالنے کی خالی بوری رکھ کر نکل پڑا۔

دُھند اِس قدر شدید کہ وقت کا اندازہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس نے گلی میں قدم رکھا تو سردی نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ جیدے نے خاکی رنگ کی شلوار قمیض کے اوپر لال رنگ کی کہنیوں سے پھٹی ہوئی جرسی پہن رکھی تھی اور سر پر کالی اونی ٹوپی پہن کر سردی سے ٹکر لینے کا اہتمام کیا تھا۔ شدید سردی کے پیشِ نظر جیدے نے ایک ہاتھ سے بوری تھام کر دوسرا ہاتھ بغل میں دبا لیا۔

جیدا سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے شیدے کے گھر پہنچا جو گلی کے نکڑ پر واقع تھا۔ اُس نے جلدی سے دروازے کی کنڈی ہلائی اور ساتھ ہی شیدے کو آواز دی۔ شیدے کی ماں نے دروازہ کھولا۔

''آج میں نے بھی شیدے کے ساتھ کچرا چننے جانا ہے اس لئے اُسے بلانے آیا ہوں۔''

''آجا اندر، ابھی شیدا لنگر کھا رہا ہے، پھر دونوں چلے جانا۔'' شیدے کی ماں نے جیدے کو چولھے کے پاس ہی بٹھا لیا۔ شیدا بھی خوش ہو گیا کہ اُسے محلے سے ساتھی مل گیا۔ شیدے نے لنگر کھا لیا تو دونوں بوریاں کاندھوں پر ڈالے کچرا چننے نکل پڑے۔

''دیکھ شیدے! مجھے تو پتہ نہیں کس جگہ سے کچرا چننا ہے، تُو جیسے بتائے گا میں ویسا ہی کروں گا۔''

''تُو فکر ہی نہ کر جیدے، مجھے سارے ٹھکانے معلوم ہیں۔'' شیدے نے تسلی دی۔

دونوں بستی سے نکل کر شہر کی طرف رواں دواں تھے۔ جیدے کے لئے آج نیا تجربہ تھا، اُس کے اندر عجیب سی ہلچل تھی۔ اُس کا دھیان پڑھائی کی طرف تھا لیکن وقت نے اُسے کچرا چننے کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ جیدا اور شیدا باتیں کرتے ہوئے کچرا کنڈی پہنچ گئے۔ شیدا اِس کام میں ماہر تھا وہ جیدے کو کچرے سے کام کی اشیاء تلاش کرنے کا طریقہ سکھا رہا تھا۔ کس طرح پلاسٹک کی خالی بوتلیں، ردی کاغذ اور پھٹے پرانے جوتے کچرے سے نکالتے ہیں۔ جیدے کو کچرے سے بدبو آ رہی تھی، وہ بار بار اپنا ہاتھ ناک پر رکھ لیتا۔

''دیکھ جیدے! اگر تُو اسی طرح کچرے سے ناک چڑھاتا رہا تو اس کام میں کیسے جم سکے گا۔''

ایک کچرا کنڈی پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد وہ بڑی کچرا کنڈی کی طرف نکل گئے۔

کُہرا کم ہونے لگا، اب حد نگاہ پہلے سے بہتر ہو گئی۔ سورج سرخی مائل رنگ کا نظر آ رہا تھا لیکن ابھی تک اُس کی کرنوں نے دھرتی پر چادر نہیں ڈالی تھی۔ جب وہ بڑی کچرا کنڈی پہنچے تو وہاں پہلے سے ہی کچھ بچے کچرا چھانٹی کر رہے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر دوسرے بچے اس طرح گھور رہے تھے جیسے کھا جائیں گے، ایسے لگ رہا تھا جیسے گدھ مردار کا گوشت نوچ رہے تھے۔ یہ سب مجبور بچے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے شدید سردی میں روزی کی فکر میں لگے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ خالی بوتل پر ایک ہی وقت میں دو بچے ایک ساتھ ہاتھ ڈال دیتے پھر جس کے بازوؤں میں زیادہ طاقت ہوتی وہی حقدار ٹھہرتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ طاقت کا دستور صرف بلند و بالا ایوانوں میں ہی نظر نہیں آتا بلکہ فٹ پاتھ پر بھی یہی قانون لاگو ہے۔

جیدا دوسرے بچوں کی طرح کچرا چننے کے بعد سلیقے کے ساتھ اپنی بوری بھر رہا تھا۔ اُس کچرے کو شینو کی دُکان پر فروخت کرتا تھا۔ جیدا بھی شیدے کے ساتھ شینو کی دُکان کی طرف چل پڑا جو تقریباً تین کلومیٹر دور تھی۔ جیدے کے کاندھے اور ہاتھ دُکھنے لگے تھے اور ٹانگوں میں بھی شدید درد ہو رہا تھا۔ اُسے کاندھے پر وزن ڈال کر اس طرح چلنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ بار بار شیدے سے کہتا ''یار ذرا دیر بیٹھ کر دم لیتے ہیں پھر چلے جائیں گے۔'' کبھی تو شیدا مان جاتا اور کبھی کہتا ''دیکھ جیدے! اگر تُو اسی طرح لڑھکتا رہے گا تو میں تجھے چھوڑ کر اکیلا ہی چلا جاؤں گا، مجھے دوپہر کے بعد گھر پہنچ کر بکری کے لئے چارہ بھی لانا ہے۔''

''نہیں یار تُو ناراض نہ ہو میں چلتا ہوں۔'' جیدا منت سماجت پر اتر آیا۔

دُکان پر پہنچتے ہی شینو نے آواز لگائی ''ابے

شیدے! یہ نیا بکرا کہاں سے پکڑ لایا ہے۔'' ہنسنے سے اُس کے پیلے دانت نمایاں نظر آرہے تھے۔

''استاد یہ اپنا ہی پٹھا ہے، یہ بھی میرے ساتھ روز آئے گا۔'' شیثو کے کہنے پر دونوں نے اپنا اپنا کچرا ایک بڑے ڈھیر کے قریب الٹ دیا۔ شیثو نے شیدے کو سات روپے اور جیدے کو پانچ روپے دے کر ٹرخا دیا، شیدا بول پڑا۔ ''بس استاد اتنے ہی پیسے۔''

''ارے چل بھاگ ادھر سے، آج کچرا ابھی کم تھا اور یہ نیا پٹھا تو ایک بھی کام کی چیز نہیں لایا۔'' شیثو نے دونوں کو بھگا دیا۔

پہلے دن پانچ روپے کما کر جیدا گھر پہنچا، نجو نے خوش ہو کر پانچ روپے لے کر اپنے آزار بند سے بندھی تھیلی میں ڈال لیے۔

جیدا کچرا اٹھا کر گھر کا گزارہ کر رہا تھا۔ اس کی تعلیم حاصل کرنے کی لگن ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اتفاق سے سرکاری اسکول کے ایک ماسٹر عبدالمجید نے بستی بھیز چال میں ناخواندہ بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ ماسٹر عبدالمجید صبح کے وقت سرکاری اسکول میں پڑھاتے اور شام کو بستی کے بچوں کو مفت تعلیم دیتے۔ ماسٹر جی کا خیال تھا کہ تعلیم دینا ملازمت نہیں بلکہ ایسی عبادت ہے جس کے لئے معاوضہ شرط نہیں۔ جیدا شام کے وقت اس جھونپڑی نما اسکول میں ماسٹر عبدالمجید کے پاس چلا جاتا۔

نجو کو اب جیدے کی تعلیم پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ وہ صبح کے وقت کام کر کے پیسے تو کما رہا تھا۔ ماسٹر عبدالمجید بچوں کو نام لکھنا اور تھوڑا بہت پڑھنا سکھاتے تاکہ یہ بچے کم از کم سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر دکان کا بورڈ یا بس کا روٹ پڑھنے کے قابل ہو جائیں۔ بستی میں تعلیم کا یہ سلسلہ پانچ برس تک چلتا رہا۔ اُس کے بعد بستی کے ایک اوباش نوجوان نے ماسٹر عبدالمجید کو سختی سے منع کر دیا، اُس کا خیال تھا کہ ہمارے بچے تعلیم کی طرف متوجہ ہو کر چھوٹے موٹے کام سے انکار کر دیں گے۔

جیدے کو کچرا اٹھاتے ہوئے چھ سال ہو گئے تھے، وہ سارے پیسے لا کر ماں کی ہتھیلی پر رکھتا تھا اس کے باوجود نجو خوش نہیں تھی۔ آج جیدے اور اُس کی ماں میں خوب لڑائی ہوئی، نجو نے صاف کہہ دیا کہ پورے 20 روپے لے کر گھر آنا ورنہ کچرا کنڈی کے پاس ہی رات کو سو جانا۔

شام کو جیدا گھر لوٹا تو ساری بستی کے لوگ اُس کے گھر جمع تھے اور سب کے چہروں پر افسردگی چھائی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی انہونی ہوئی ہے، ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا تو نجو کی لاش چارپائی پر پڑی تھی۔ لوگوں نے اُسے بتایا کہ کوئی ایک گھنٹہ قبل تمھاری ماں شہر سے بستی کی طرف آرہی تھی کہ سڑک پار کرتے ہوئے ایک کار کے نیچے آکر کچلی گئی اور موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ جیدے کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

''ماں آنکھیں کھولو یہ دیکھو، میں پورے 20 روپے لے کر آیا ہوں۔'' جیدا ماں کی چارپائی کے سرہانے کھڑا ہو کر روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ آج دنیا میں بالکل اکیلا ہو گیا تھا۔

روز و شب کی چرخی گھومتی رہی، جیدے کی عمر 20 سال ہو چکی تھی۔ ایک صبح وہ اکیلا ہی کچرا اٹھا رہا تھا کہ اُسے ایک خاکی رنگ کا لفافہ نظر آیا۔ اُس نے سوچا کہ اس کے اندر کاغذ ہوں گے، اُس نے بے تابی سے لفافہ کھولا تو اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، لفافے میں پرائز بانڈ تھے۔ اُس نے ماسٹر عبدالمجید سے اتنا تو سیکھ لیا تھا کہ اردو اور انگریزی کے واجبی حروف پڑھ لیتا۔ جیدے نے فوراً لفافہ بند کیا اور کچرا چھوڑ کر وہ لفافہ احتیاط کے ساتھ بوری میں رکھ لیا اور گھر کی راہ لی۔ راستے میں اُس کا دوست شیدا مل گیا، وہ حیران تھا کہ جیدا اتنی جلدی واپس آگیا۔ شیدے نے اُسے کریدنے کی بہت کوشش کی لیکن جیدا یہ خوشی کا کسی سے ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا، اُس نے سر درد کا بہانہ بنایا اور شیدے سے جان چھڑائی۔ گھر پہنچتے ہی اُس نے سب سے پہلے دروازے کی کنڈی لگائی اور کمرے میں جا کر لفافہ بوری سے نکالا۔ جیدے کو محسوس ہونے لگا کہ اُس کے بُرے دن ختم ہو گئے۔

جب پرائز بانڈ کو گنا تو 100 روپے والے ایک ہزار پرائز بانڈ تھے۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ جیدے نے وہ لفافہ ایک پرانے کپڑے میں لپیٹ کر لکڑی کے صندوق میں رکھ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر مہینے کی آخری تاریخ کو انعام نکلتا ہے۔ مہینہ ختم ہونے میں ابھی دس روز باقی تھے، وہ عرصہ بڑی بے چینی سے گزار رہا تھا کہ مہینے کی آخری تاریخ آپہنچی، وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کی قسمت بدلنے والی ہے۔

صبح اٹھ کر اُس نے اخبار خریدا اور گھر لا کر پرائز بانڈ کے نمبر ملانے لگا۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ وہ احتیاط سے ایک ایک نمبر دیکھ رہا تھا، بالآخر ایک نمبر دیکھتے ہی اُس نے ہوا میں مُکا لہرایا

''میں جیت گیا، میں جیت گیا۔''

اُس کا دس لاکھ روپے کا انعام نکل آیا تھا۔ دس لاکھ میں کتنے صفر ہوتے ہیں وہ انگلیوں پر گننے لگا۔ جیدے نے آج تک ایک ہزار روپے ایک ساتھ نہیں دیکھے تھے اور اب دس لاکھ کا مالک بننے والا تھا اُس کے پاس ایک بھی ڈھنگ کا سوٹ نہیں تھا۔ جیدا سوچ میں پڑ گیا کہ اگر میلے کچیلے کپڑوں میں بینک گیا تو عملہ

سمجھ جائے گا کہ اُس نے پرائز بانڈ کہیں سے چُرائے ہیں۔ اُس نے صندوق سے اپنی تمام جمع پونجی نکالی اور بازار چلا گیا۔ گرم حمام پر حجامت بنوائی اور اپنے لئے ایک شلوار قمیض اور جوتے خریدے۔ جب واپس آیا تو اُس کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ بستی کے لوگوں نے آج پہلی بار اُسے غور سے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اُس نے نیا سوٹ زیب تن کیا، جیتا ہوا پرائز بانڈ اور شناختی کارڈ سامنے والی جیب میں ڈال کر بینک کی طرف روانہ ہو گیا۔ بینک جاتے ہوئے راستے میں اُسے ہر شے اُجلی اُجلی نظر آرہی تھی۔ وہ بار بار اپنی جیب پر ہاتھ رکھ کر دیکھتا کہ قسمت کی چابی اُس کی جیب میں ہے نا۔۔۔۔۔ جیدے کے اندر عجیب ہلچل مچی تھی اور ذہن میں خیالات کا ایک طوفان تھا۔ اگر بینک والوں نے سوال کیا کہ تم نے یہ پرائز بانڈ کب خریدا تو اُس کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ وہ لرزتی ٹانگوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ بینک میں داخل ہو گیا۔

زندگی میں پہلی بار کسی سرکاری عمارت میں وارد ہوا تھا۔ بینک کی چکا چوند روشنی اُس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ جیدا کامیابی سے ایک قدم دور تھا۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی جیب سے 100 روپے والا انعام یافتہ پرائز بانڈ نکال کر اکاؤنٹینٹ کے سامنے رکھ دیا۔ اکاؤنٹینٹ نے پرائز بانڈ لے کر اُسے انتظار کرنے کے لئے کہا، وہ جو تا گھسیٹتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا اور بینک کے در و دیوار کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے بچہ پہلی دفعہ چڑیا گھر آیا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد اکاؤنٹینٹ نے اُسے بلا کر واؤچر پر دستخط لئے اور اُسے کیشیئر کے پاس بھیج دیا۔ کیشیئر نے اُسے دس لاکھ روپے ادا کر دیئے۔ اُس نے کیشیئر سے ایک سفید لفافہ لے کر دس لاکھ روپے اُس میں ڈال لیئے۔ خاکی لفافے سے سفید لفافے تک پہنچتے ہوئے وہ لاکھ پتی بن چکا تھا۔

جیدا ڈگ بھرتا ہوا بینک سے باہر نکل آیا، آج وہ ایک عجیب احساس سے آشنا ہوا تھا۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ سامنے نظر آنے والی ہر قیمتی شے خرید لے۔ وہ تمام خواہشات جو آج تک حسرت بن کر سینے میں دفن تھیں اُن کو کھود کے باہر نکالے اور ہر خواہش پوری کر لے۔ وہ غور سے انسانوں کے چہرے پڑھتا ہوا گزر رہا تھا، اسی سرشاری کیفیت میں گھر پہنچ گیا۔ گھر پہنچ کر اُس نے اندر سے کنڈی لگائی اور کمرے میں جا کر نوٹوں کو دوبارہ گننے لگا۔ اُسے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ کرنسی نوٹوں سے بھی خوشبو آتی ہے۔

کئی روز غور و فکر کے بعد اُس نے پرانے پلاسٹک سے نئے پائپ بنانے کی مشینیں خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے ایک آدمی سے پانچ لاکھ میں دو استعمال شدہ مشینیں خرید لیں اور ایک عمارت لے کر پلاسٹک کے پائپ بنانے کا آغاز کر دیا۔ اب وہ جیدے سے جاوید احمد بن گیا۔ کاروبار میں روز بروز ترقی ہونے لگی، ایک سال کے بعد اُس نے دو اور مشینیں لگا لیں اور اُسی علاقے میں ایک گھر بھی کرائے پر لے لیا۔ جاوید احمد قسمت کا دھنی نکلا، وہ کچرا چننے ہوئے ایک کارخانے کا مالک بن گیا۔ دو سال کے بعد اُس نے اپنا مکان خرید لیا اور خوشحال زندگی گزارنے لگا۔

جب گھر میں خوشحالی آئی تو گھر بسانے کی بھی فکر ہونے لگی، اُس نے محلے کی ایک لڑکی شبانہ سے شادی کر لی۔ جاوید احمد دن بدن ترقی کی منزلیں طے کرتا جا رہا تھا۔ وہ مٹی ہاتھ میں لیتا تو سونا بن جاتی۔ شادی کے تین سالوں میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بیٹی اور بیٹے کی نعمت سے نواز دیا۔ اس طرح اُن کا گھرانہ مکمل ہو گیا۔ جاوید احمد کے لئے ہر دن عید اور رات شب برات کا سماں تھا۔ وقت کا پنچھی اپنی رفتار سے اُڑ رہا تھا، جاوید احمد گھر اور کارخانے کی مصروفیات میں مگن رہتا۔

آج صبح جب وہ کارخانے جانے کے لئے نکل رہا تھا تو شبانہ نے کہا ''شام کو جلدی آجایئے، مجھے خریداری کے لئے جانا ہے اور بچے بھی تھوڑی دیر باہر گھوم لیں گے۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔'' جاوید احمد نے جھک کر کہا۔

شام کے وقت وہ بازار جا رہے تھے۔ جاوید احمد کی بیٹی سدرہ نے کہا ''ابا جان! مجھے پیاس لگ رہی ہے۔'' اُس نے گاڑی سڑک کے کنارے روکی اور ایک قریبی اسٹور سے جوس لینے چلا گیا۔ وہ جوس لے کر ابھی پلٹا ہی تھا کہ ایک بم دھماکہ ہوا اور سب کچھ اڑ گیا۔ جاوید احمد کو کچھ ہوش نہیں رہا کہ کیا ہوا؟ جب ہوش آیا تو وہ اسپتال میں پڑا تھا۔ اُس کی دونوں ٹانگوں پر پلستر لگا ہوا تھا اور وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا۔ دو روز تک وہ نرس سے پوچھتا رہا کہ اُس کے بیوی بچے کہاں ہیں بالآخر نرس نے ڈاکٹر کی اجازت سے بتا دیا کہ بم دھماکے میں 30 افراد کے ہمراہ اُس کے بیوی بچے بھی شہید ہو گئے۔ وہ بستر پر پڑا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اُس کی دنیا تاریک ہو چکی تھی۔

تین چار روز کے بعد ایک آدمی اسپتال آیا اور جاوید احمد سے کہا ''میں ایک سماجی کارکن ہوں، جو لوگ بم دھماکے میں ہلاک ہوئے تھے اُن کے لواحقین کو گورنمنٹ معاوضہ دے رہی ہے، تم کچھ کاغذات پر

دستخط کر دو تا کہ تمہارا بھی کلیم داخل کیا جا سکے۔'' جاوید احمد نے کوئی سوال نہ کیا اور بے دلی سے اُس آدمی کے کہنے پر تمام کاغذات پر دستخط کر دیے۔ تقریباً ایک ماہ اسپتال رہنے کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ گھر پہنچا تو اُس کے گھر پر کامران ملک کے نام کی تختی لگی تھی۔ اُس نے گھنٹی بجائی تو ایک شخص نے دروازہ کھولا۔ جاوید احمد حیران ہو گیا کہ ایک اجنبی شخص میرے گھر میں کیا کر رہا ہے۔ جاوید احمد نے ہونق چہرے سے پوچھا'' آپ کون، ہیں اور میرے گھر میں کیسے داخل ہوئے۔''

''میں کامران ملک ہوں اور دو ہفتے پہلے ہی میں نے یہ گھر خریدا ہے، آپ کون ہیں؟'' کامران ملک نے الٹا سوال کر دیا۔

''دیکھیے، میں جاوید احمد اس گھر کا مالک ہوں۔''

''جاوید صاحب! میں نے یہ گھر اور آپ کا کارخانہ خرید لیا ہے۔''

''لیکن میں نے فروخت ہی نہیں کیا تو آپ نے خریدا کیسے؟'' جاوید احمد نے حیرانی سے کہا۔

''ایک سماجی کارکن طاہر جنجوعہ کو آپ نے مختار نامہ دیا تھا، اُس نے مجھے کہا کہ جاوید صاحب ایک بم دھماکے میں زخمی ہو گئے ہیں، اُن کو پیسوں کی سخت ضرورت ہے اور وہ اپنی تمام جائیداد فروخت کرنا چاہتے ہیں، میں نے رقم ادا کر کے گھر اور کارخانہ خرید لیا'' کامران ملک نے وضاحت کی۔

''میں نے کسی کو مختار نامہ نہیں دیا۔'' جاوید احمد نے جھنجھلاہٹ سے کہا۔

''آپ ایک منٹ ٹھہریں، میں آپ کو اُس مختار نامے کی کاپی دکھاتا ہوں۔'' کامران ملک نے اپنی بیگم کو آواز دی کہ ذرا وہ مکان اور کارخانے کے کاغذات نکالو۔

کامران ملک نے جاوید احمد کو مختار نامہ دکھا کر پوچھا'' کیا یہ آپ کے دستخط ہیں؟''

''بالکل میرے دستخط ہیں، لیکن یہ دھوکے سے لیے گئے ہیں۔'' جاوید احمد سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''آپ عدالت جائیں اور اس دھوکے کو ثابت کریں میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' کامران ملک نے کاغذات اپنی بیگم کو پکڑاتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔

کاغذات دیکھنے کے بعد جاوید احمد کو ایسا جھٹکا لگا کہ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ کامران ملک نے جاوید احمد کو تسلی دیتے ہوئے کہا'' جاوید صاحب، زندگی میں کبھی انسان کو نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا ہے، 8/10 برس پہلے ہم نے ایک لاکھ روپے کے پرائز بانڈ غلطی سے بڑی کچرا کنڈی میں پھینک دیے تھے لیکن ہم نے اُس نقصان کو برداشت کیا۔''

''وہ ایک لاکھ کے پرائز بانڈ آپ کے تھے؟'' جاوید احمد نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا آپ کو ہمارے پرائز بانڈ کے بارے میں علم ہے؟'' کامران ملک نے تجسس سے دریافت کیا۔

''نہیں نہیں، مجھے کیسے علم ہو گا'' جاوید احمد نے نظریں چُراتے ہوئے جواب دیا۔

جاوید احمد پاؤں گھسیٹتا ہوا اُس گھر سے نکل آیا جو اب اُس کا نہیں تھا۔ اُس کی منزل اب بستی بھیڑ چال تھی، جہاں وہ برسوں کے بعد جا رہا تھا۔ وہاں جا کر دیکھا تو بستی کا نقشہ بدل چکا تھا۔ اُس نے اپنا گھر تو تلاش کر لیا لیکن اُس پر کسی دوسرے نے قبضہ کر لیا تھا۔ جاوید نے ایک خالی چھپر دیکھا تو اُس میں پناہ لے لی۔ اُس نے دوبارہ کچرا چننا شروع کر دیا۔ وہ جب شام کے وقت تھک ہار کر اپنی کٹیا میں آتا تو بیوی بچوں کی یاد اُسے مغموم کر دیتی۔ اسی طرح روز و شب گزرنے لگے۔

آج یکم جنوری کا دن تھا۔ صبح اس قدر برفیلی ہوا چل رہی تھی کہ بدن میں برف سی بھر گئی تھی۔ جاوید کا دل چاہا کہ اپنے پیوند لگے کمبل سے چمٹا رہے مگر بیزاری سے اٹھ کر باہر نکلا اور گلی کے کونے پر لگے نلکے سے منہ پر پانی کا چھینٹا مارا، پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ منہ سُن ہو گیا۔ آج اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ کچرا چننے نہ جائے لیکن پیٹ کی آگ خیالوں سے کب بجھتی ہے۔ وہ بادل نخواستہ بوری اٹھا کر بڑی کچرا کنڈی کی طرف چل دیا۔

کچرا کنڈی پہنچ کر ششدر رہ گیا۔ خاکدان بالکل خالی تھا اور اردگرد بھی صفائی کی گئی تھی۔ اُس نے قریبی دُکاندار سے پوچھا'' بھائی! آج اس قدر صفائی کیوں ہے؟'' اُس آدمی نے بتایا'' کل شام سے ہی شہر کی صفائی ہو رہی ہے۔ سنا ہے نومنتخب میئر آج شہر کی صفائی دیکھنے آئے گا۔'' جاوید نے سوچا کہ چلو اُس آدمی کی ایک جھلک دیکھ لیں جس کی خاطر سارا شہر صاف ہو گیا۔

دو گھنٹے بعد گاڑیوں کا ایک قافلہ آیا، ہر گاڑی پر پارٹی پرچم لہرا رہا تھا۔ پجیرو جیپ کی چھت کا شیشہ کھول کر کھڑا ایک آدمی ہاتھ ہلا ہلا کر استقبال کرنے والوں کے خیر مقدمی نعروں کا جواب دے رہا تھا۔ لوگ اپنے محبوب رہنما کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ جاوید کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس کو دھوکے سے لوٹنے والا سماجی کارکن شہر کا میئر کیسے بن گیا؟-----

سبز گلاب

عامر بن علی

ایک جاپانی کسان کی نوجوان بیٹی نے ایک رات عجیب خواب دیکھا۔ عجیب اس لیے کہ پھولوں سے بھرے اس سپنے کا مرکزی نقطہ سبز رنگ کا گلاب تھا۔ گلاب کی دنیا بھر میں سینکڑوں اقسام پائی جاتی ہے اور بیسوں رنگ اس کلاسیکی پھولوں کو زیبائی بخشتے ہیں، مگر سبز رنگ کا گلاب تو آج تک اس عالم رنگ و بو میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ دوشیزہ کے خواب کا دلچسپ حصہ یہ تھا کہ سبز رنگ کا یہ ایک پھول بازار میں ایک ہزار روپے میں فروخت ہو رہا ہے۔ لڑکی نیند سے جاگی تو اس نے اپنا یہ خواب من وعن اپنے کسان باپ کو سنا دیا جو کئی دہائیوں سے پھولوں کی کاشت سے منسلک تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کسان نے اپنی بیٹی کا یہ خواب، اپنے چار کاشتکار دوستوں سے مل کر سچ کر دکھایا، سالہا سال کی سخت مشقت، محنت اور تجربات سے گزرنے کے بعد کسانوں کی یہ پانچ رکنی ٹیم سبز رنگ کا گلاب پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اس ماہ سبز گلاب کو نا صرف نمائش کے لیے پیش کیا گیا بلکہ تجارتی پیمانے پر اس کی فروخت بھی شروع کر دی گئی ہے۔ تقریباً ہر رنگ کے گلاب کے ساتھ دنیا بھر میں اساطیر وابستہ ہیں۔ جتنی کہانیاں منفرد ہے، تو اہم اور اظہاریے اس پھول سے منسلک ہیں شاید ہی کسی اور گل سے جڑے ہوں۔ زرد رنگ کا گلاب بیزاری جدائی کی خواہش کا اظہار بھی ہو سکتا ہے۔ سرخ گلاب ہر دیس میں محبت اور خوشی کا رنگ سمجھا جاتا ہے۔ گلابی اور سفید گلاب نیک خواہشات، پاک جذبات اور روحانیت کے لیے، ہمارے کلاسیکی ادب محبوب کے لبوں کی تازگی کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ سبز رنگ کا گلاب شاید امارت، خوشحالی اور ترقی کی علامت کہلائے گا۔

یورپ کا رواج بھی خوب ہے کہ گلاب کے پھول ہمیشہ طاق تعداد میں تحفتاً پیش کیے جاتے ہیں، ایک، تین، پانچ، سات، جفت تعداد میں گلابوں کا تحفہ منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ مرنے والوں کے جنازے اور آخری رسومات میں شرکت کرتے ہوئے ہمیشہ جفت تعداد میں گلاب کے پھول ہدیہ کیے جاتے ہیں۔ پھول تو چاہے دنیا کے کسی بھی ملک کے ہوں، خوبصورت ہی لگتے ہیں مگر یہاں کے پھولوں میں ایک خرابی ہے۔ ان میں خوشبو نہیں ہوتی، آپ سبزیاں اور درختوں کے پتے سونگھ لیں یا گلاب اور دیگر پھول، آپ کو انیس اور بیس کا فرق بھی معلوم نہیں ہوگا۔ پاکستان جیسے خوشبودار پھول مجھے کہیں بھی نہیں ملے۔ اس سے بڑا ظلم بھلا کیا ہوگا کہ یہاں مندروں، معبدوں اور قبروں پر چڑھائے جانے والے پھولوں پر خوشبودار پرفیوم چھڑکا جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بھگوان کے ساتھ کھلا دھوکا اور مردوں کے ساتھ فراڈ ہے۔ بارِ دیگر عرض کرتا ہوں کہ پھول پھر پھول ہیں، خوبصورت تو لگتے ہی ہیں۔ عام لوگوں کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہٹلر جیسے ظالم شخص کو بھی پھول پسند تھے اور وہ بچوں سے بہت پیار کرتا تھا۔ روسی کیمونسٹ انقلاب کا معمار لینن سخت گیر مشہور ہے، مگر اس کے کوٹ پر ہمیشہ ایک پھول سجا ہوتا تھا، بعد ازاں یہ جنگلی پھول یورپی سوشلسٹ کارکنوں کے یونیفارم کا ضروری حصہ بن گیا، یہ پھول لینن کے ساتھ اس طرح منسلک ہوا کہ اب بھی میں نے دیکھا ہے کہ کیمونزم کے مخالف روسی نژاد لوگ اس پھول کو دیکھ کر اکثر چڑ جاتے ہیں اور سوشلسٹ خیال رکھنے والے لوگ اب بھی اسے سینوں پر ٹانکتے ہیں۔

جارج برنارڈ شا کی اس بابت اپنی منطق تھی۔ پھولوں سے اسے بے حد پیار تھا، مگر توڑنا وہ گوارا نہیں کرتا تھا۔ جس گھر میں وہ رہتا تھا اس کے لان میں پھول ہی پھول اگے ہوئے تھے۔ ایک دن اس کا ایک دوست اس کے گھر ملنے آیا برنارڈ شا اسے لینے کے لیے خود دروازے پر آیا اور اپنا سارا مکان اندر سے دکھایا۔ دونوں جب سٹڈی روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو عزیز دوست برنارڈ شا سے کہنے لگا کہ ایک چیز دیکھ کر میں بہت حیران ہوا ہوں، تمہارا باغیچہ تو پھولوں سے لدا پڑا ہے لیکن تمہارے گھر کے کسی گلدان میں ایک بھی پھول نہیں سجا ہے۔ برنارڈ شا نے جواب دیا کہ مجھے تو بچے بھی بہت پیارے لگتے ہیں لیکن میں ان کا گلا کاٹ کر میز پر نہیں سجا سکتا، تزئین و آرائش کا یہ طریقہ مجھے پسند نہیں۔ یہ وضاحت کرتا چلوں کہ برنارڈ شا سے مراد یہاں برطانوی دانشور، مصنف اور فلسفی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت یوں پیش آئی ہے کہ ہمارے دوست عدنان شیرازی کے بقول، سیالکوٹ ڈگری کالج میں انگریزی کے ایک فاضل پروفیسر نے ایک ہونہار طالب علم سے پوچھا کہ برنارڈ شا کون ہے؟ طالب علم کا جواب تھا ''سر جی وہ ضرور علی پور سیداں کے سادات میں سے ہی کوئی ہوگا''۔ جو کہ

ہمارے شاہ جی کا آبائی علاقہ بھی ہے۔

خواب کی بات ہو رہی تھی، متذکرہ جواں سالہ کسان زادی نے اپنے خواب میں جو سبز رنگ کا گلاب دیکھا اس کا ایک نام بھی تھا'' کوکوسارے'' جو ایک ہزار روپے کے عوض بازار میں ایک عدد پھول فروخت ہو رہا تھا۔ تازہ ترین احوال یہ ہے کہ لڑکی کے والد نے دیگر چار کسانوں کے ساتھ مل کر جنھوں نے سبز رنگ کے گلاب کو خواب سے حقیقت میں تبدیل کر دیا۔ وزارت زراعت میں اس پھول کو'' کوکوسارے'' کے نام سے رجسٹرڈ کرنے کی درخواست دائر کر دی ہے۔ گویا اس کا خواب حرف بہ حرف حقیقت بننے جا رہا ہے۔ سبز لباس پہن کر پیدا ہونے والی گلاب کی یہ قسم ''سبز گلاب'' کہلاتی ہے۔ جس میں نوک شاخ پر ہمارے دیسی گلاب کی طرح واحد پھول کی بجائے پھولوں کا ایک گچھا لگتا ہے۔ سبز رنگ کے گلاب کا تصور پیش کرنے والی خاتون کے والد کا کہنا ہے کہ جب میں نے مذکورہ خواب سنا تو میرے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا کہ اگر میں اسے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ پھول بہت زیادہ فروخت ہوگا کیونکہ میں نے بھی اپنی زندگی میں سبز گلاب نہیں دیکھا تھا۔ آج یہ سبز گلاب حقیقت بن کر ٹوکیو سمیت کئی شہروں میں پھولوں کی دکانوں پر دستیاب ہے۔ اور عام پھولوں سے دگنی قیمت پر فروخت بھی ہو رہا ہے۔ پھول کی کامیابی ہی غالباً اس کی گراں قیمت کی وجہ ہے۔ چونکہ ابھی تک ضلع آئیچی کے فقط مذکورہ پانچ کاشتکار ہی تجارتی بنیادوں پر اسے کاشت کر رہے ہیں۔ میرا شکوہ نما اعتراض تو اس پھول پر بس یہی ہے کہ یہ بھی یہاں کے دیگر پھولوں کی طرح خوشبو سے عاری ہے۔

غزلیں / جاوید قاسم

لمحہ لمحہ ٹوٹا، بکھرا، جاگا، شعر کہے
غم جہاں میں اکثر شب بھر رویا، شعر کہے

اور تو مجھ سے چاہتا کیا ہے دورِ نا ہنجار
میں نے مردہ لوگوں میں بھی زندہ شعر کہے

سارا منظر دُھواں دُھواں ہے، گرد آلود فضا
پھر بھی تیرا شاعر جاناں! اچھا شعر کہے

صحرا جیسی وحشت جن میں، جنگل جیسا خوف
میں نے ایسی راتوں میں بھی سوچا، شعر کہے

دنیا ظرف سے خالی نکلی، جس نے قدر نہ کی
کیسے کیسے مضموں باندھے، کیا کیا شعر کہے

وقت پکارا اُٹھے گا خود ہی، میں گھبراؤں کیوں
کس نے لفظ سنوارے، کس نے عمدہ شعر کہے

کون یہاں درویش صفت ہے، کون یہاں مجذوب
کون ترے جیسا پھر قاسم سچا شعر کہے

....

یہ ہاتھ پاؤں اگرچہ تھے کشتیوں جیسے
ملے ہیں کرب بھی ہم کو سمندروں جیسے

کھلا ہے دشتِ تمنا میں اک گلاب ایسا
تمام رنگ ہیں آنکھوں میں تتلیوں جیسے

یہ کون دست و گریباں رہا ہے موجوں سے
یہ کیسے نقش ہیں پانی پہ اُنگلیوں جیسے

ہم ایک تازہ شجر تھے مگر زمانے میں
ملے ہیں لوگ پرانی حویلیوں جیسے

ہُوا ہی لوٹ کے آئی نہ اس طرف ورنہ
کھلے ہوئے تھے بدن اپنے کھڑکیوں جیسے

بچھا کے ترچھی لکیریں زمین پر قاسم
فلک بناتا ہوں اپنی ہتھیلیوں جیسے

غزلیں / ڈاکٹر جواز جعفری

مری تاریک شبوں میں بھی اُجالا آئے
ٹوٹ کر پھر وہ مجھے چاہنے والا آئے

تو جو جائے تو مرے گھر میں اندھیرے ناچیں
تو جو آئے تو ترے ساتھ اُجالا آئے

بن رہا ہے مرے آنگن میں اندھیرا جالے
پھر مری سمت کوئی نور کا ہالا آئے

میں بھی ہر حال میں حق بات کو حق کہتا ہوں
مرے حصے میں بھی اک زہر پیالہ آئے

میں یہاں ایک سے چہروں کو کہاں تک دیکھوں
شہر میں کوئی تو اک شخص نرالا آئے

رہِ پُرخار پہ وہ شخص چلا کیسے جواز
اک سطرِ خط جو لکھے ہاتھ پہ چھالا آئے

....

ابھی تھا تکیے کے نیچے پڑا یہاں مرا خواب
چرا کے لے گئی اک چشمِ مہرباں مرا خواب

میں اپنے بچوں کی آنکھوں میں بو رہا ہوں اسے
کہ میرے بعد رہے یوں ہی جاوداں مرا خواب

کھلی جو آنکھ تو پل میں بجھ گئی تعبیر
کسے خبر تھی کہ جائے گا رائیگاں مرا خواب

پکڑ رہا ہے یہ اس خاک چشمِ سبز میں جڑ
سو شاخِ زرد پہ کھل پائے گا کہاں مرا خواب

رواں ازل سے ہے ارض و سما کی یہ چکی
سو پس رہا ہے دو پاٹوں کے درمیاں مرا خواب

کہ اس سے پہلے کھنڈر ہو زمین کی وادی
خلا میں تیرتی آسودہ بستیاں، مرا خواب

جہاں سے کوئی کڑی گم تھی اس کتھا کی جواز
وہیں سے آگے سناتا ہے داستاں مرا خواب

ادبی خبریں/تقریبات

فرزانہ ناز کی یاد میں تعزیتی ریفرنس

پاکستان رائٹرز پارلیمنٹ کے زیراہتمام اکادمی ادبیات پنجاب آفس میں المناک حادثے میں جاں بحق ہونے والی شاعرہ فرزانہ ناز کی یاد میں تعزیتی ریفرنس منعقد کیا گیا جس کی صدارت سینئر ترین شاعر پروفیسر اعتبار ساجد نے کی جبکہ معروف شاعر ناصر بشیر اور سلطانہ بٹ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ تقریب کی نظامت اور میزبانی کے فرائض کرن وقار نے سرانجام دیئے۔ اس تعزیتی ریفرنس میں فرزانہ ناز کے شوہر جناب اسماعیل بشیر نے خصوصی طور پر شرکت کی۔ تعزیتی ریفرنس کے مقررین میں ممتاز راشد لاہوری، ڈاکٹر امجد طفیل، حسن عباسی، پروفیسر فہمیدہ کوثر، جاوید آفتاب، عالیہ بخاری بالہ، صائمہ الماس، آئینہ مثال، پروین وفا ہاشمی، رابعہ رحمان، ولایت فاروقی، سید امر، بی اے شاکر، زاہد حسن، عقیل اختر، محمد جمیل اور پاکستان رائٹرز پارلیمنٹ کے چیئرمین محمد نواز کھرل اور دیگر شامل تھے۔ مقررین نے کہا کہ فرزانہ ناز بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعہ ''ہجرت مجھ سے لپٹ گئی'' کی شاعری دلوں کو چھونے والی شاعری ہے۔ فرزانہ ناز جیسی باکمال شاعرہ کا ایک روح فرسا حادثے میں ہم سے بچھڑ جانا بہت دردناک سانحہ ہے۔ تعزیتی ریفرنس کے صاحب صدر پروفیسر اعتبار ساجد نے کہا کہ فرزانہ ناز کی شاعری ہمیشہ زندہ رہنے والی شاعری ہے۔ فرزانہ ناز کی حادثاتی موت ادبی برادری کیلئے لامحدود غم کا باعث ہے لیکن فرزانہ ناز کی یادیں اور باتیں ہمیشہ ہمارے دلوں میں چراغاں کرتی رہیں گی۔ فرزانہ ناز کے شوہر اسماعیل بشیر نے اپنی گفتگو میں مطالبہ کیا کہ فرزانہ ناز کو ''شہید کتاب'' قرار دیا جائے اور اس کی موت کے حادثے کی تحقیقات کروا کر ذمہ داروں کو کڑی سزا دی جائے۔ انہوں نے کہا کہ فرزانہ ناز صرف اچھی شاعرہ، کالم نگار اور کمپیئر ہی نہیں بلکہ ایک مثالی بیوی، ماں اور بیٹی بھی تھی۔ اس کی شاعری الہاماتی شاعری ہے جس میں گہری باتیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ناصر بشیر نے کہا کہ فرزانہ ناز کی شاعری خوابوں، گلابوں اور ہجرتوں کی شاعری ہے۔ اس کی شاعری کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ سعد اللہ شاہ نے کہا کہ فرزانہ ناز کا اچانک ہم سے جدا ہو جانا کبھی نہ بھولنے والا المناک سانحہ ہے۔ اس سانحہ کی تحقیقات ہونی چاہئیں۔ تعزیتی ریفرنس کے آخر میں فرزانہ ناز کیلئے فاتحہ خوانی بھی کی گئی۔

حلقہ فکر و فن کی جانب سے ڈاکٹر عمرانہ مشتاق کے اعزاز میں مشاعرے کا انعقاد

(رپورٹ: ڈاکٹر حنا امبرین، ریاض)

لاہور سے تشریف لانے والی معروف صحافی، کالم نگار، اینکر پرسن، شاعرہ، ادیبہ، چیئرپرسن انٹرنیشنل رائٹرز کونسل اور چیف ایگزیکٹو بقائی وی محترمہ ڈاکٹر عمرانہ مشتاق کی سعودی دارالحکومت ریاض آمد کے موقع پر حلقہ فکر و فن کی جانب سے ان کے اعزاز میں استقبالیہ اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ جس کے مہتمم و میزبان حلقہ فکر و فن کے ناظم الامور ڈاکٹر طارق عزیز اور ڈپٹی سیکرٹری جنرل ڈاکٹر حنا امبرین طارق تھے۔ اس تقریب کی نظامت ڈاکٹر حنا امبرین نے خوش اسلوبی سے سرانجام دی۔ تقریب کا باقاعدہ آغاز ڈاکٹر محمود احمد باجوہ نے تلاوت قرآن سے کیا۔ جبکہ ہدیہ نعت ڈاکٹر سعید احمد ونس نے پیش کیا۔ ڈاکٹر عمرانہ مشتاق کا تفصیلی تعارف حلقہ فکر و فن کے صدر ڈاکٹر محمد ریاض چوہدری نے پیش کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر عمرانہ مشتاق ایک صحافی، کالم نگار، اینکر پرسن، شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ میں انہیں ریاض آمد پر حلقہ فکر و فن کی جانب سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ عمرانہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ کشادہ نظر اور معاملہ فہم شاعرہ آسمان ادب پر کہکشاں بن کر جلوہ ہائے صد رنگ بکھیر رہی ہیں۔ ان کی غزل اور نظم کا مطالعہ خوش گوار اور مسرت افزا ہے۔ جبکہ ان کا جذبہ محبت پر یقین اور اعتماد ان کی شاعری شہر محبت کی گلیوں میں گشت کرتی اور اس کے باغوں سے پھول چنتی نظر آتی ہے۔

شعرائے فکر و فن عبدالرزاق تبسم، وقار نسیم وامق، عابد شمعون چاند، محمد صابر قشنگ اور حنا امبرین نے اپنے کلام دل پذیر سے سامعین کو محظوظ کیا۔ جبکہ محترمہ نسیم امجد، سجاد چوہدری، چوہدری نصیر احمد، ڈاکٹر محمود احمد باجوہ احسن عباسی، ذکاء اللہ محسن، الیاس رحیم اور محترمہ فرح احسان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معزز مہمان کو خوش آمدید کہا۔

ڈاکٹر عمرانہ مشتاق نے اپنے اعزاز میں استقبالیہ منعقد کرنے پر حلقہ فکر و فن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اپنے وطن سے دور پردیس میں شعر و ادب کی ترویج و ترقی میں اپنا کردار ادا کرنے والے واقعی لائق تحسین ہیں۔ آج کی اس محفل میں انہیں ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے وہ لاہور میں ہیں۔ انہوں نے سعودی عرب میں ادب کی ترویج و ترقی کے لیے حلقہ فکر و فن کی خدمات کو سراہا۔ عمرانہ نے وقار نسیم وامق کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ ان کی ہی وجہ سے ممکن ہوا کہ انہیں شہر ریاض میں اتنے اچھے ادبی دوستوں سے ملاقات کا موقع میسر آسکا۔ انہوں نے اس موقع پر اپنا کلام بھی عطا کیا جس سے شرکائے تقریب خوب محظوظ ہوئے۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: حرف حرف حیرت/مصنف: ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار/صفحات: 128 / قیمت: 300 روپے/تبصرہ نگار: ڈاکٹر صغرا صدف
ناشر: نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ کی شخصیت الہام کی کئی تہوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ ان کا ظاہری پہلو آدمی کے بدن میں پڑی دراڑوں کی لیپا پوتی میں مصروف رہتا ہے جبکہ باطن روحانی شعاعوں سے بدن سے رِسنے والے درد کا علاج کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان عبداللہ صوفی ہیں لیکن صوفیا کے حلقے میں ان کا مکتبۂ فکر متعین کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ وہ کبھی وحدت الوجودی پیرہن اوڑھ کر ''ھو'' کی آواز کا حصہ بن جاتے ہیں اور کبھی ان کا احساس مست ملنگ کی طرح تھیا تھیا ناچ کر عاشق ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ ان کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ ایک خاص معنویت رکھتا ہے۔ بعض اوقات وہ خالصتاً تصوف کی روح سے سرشار گفتگو میں مزاح کا تڑکہ لگا کر اسے عام فہم بنا دیتے ہیں۔ وہ ایک محبت کرنے والی شخصیت ہیں ان کی آنکھ ہر ذرّے میں خیر تلاشتی اور قلم خیر کو تصویر کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اقوال پر مبنی کتاب علمی، ادبی، مزاح اور تصوف کے چاہنے والوں کے لیے ایک ایسا تحفہ ہوگی جو ان کی شخصیت کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ ان کے جمالیاتی ذوق کی تربیت بھی کرے گی۔ یہ اقوال انسان کو اندرون باطن جھانکنے کی ترغیب دے کر اسے اصلاح کے ایسے راستے پر چلنا سکھاتے ہیں جو انسانیت کو ایک منزل کی طرف لے جاتا ہے وہی منزل جو نجات کی ہے۔ میری دعا ہے ڈاکٹر صاحب اسی طرح طبی اور روحانی خدمات سرانجام دیتے ہوئے مریضوں کے زخموں پر ایلوپیتھک دوائیوں کے ساتھ ساتھ شگفتگی کا مرہم اور روحانیت کا دم بھی کرتے رہیں اور ان کی معصوم گفتگو میں پراسراریت، لہجے میں محبت اور آنکھوں میں شرارت قائم رہے کیونکہ یہی ان کی ذات کی خوبصورتی ہے۔

نام کتاب: ذرہ ذرہ کائنات/مصنف: ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار/صفحات: 120 / قیمت: 300 روپے/تبصرہ نگار: حسن عباسی
ناشر: نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، کالم نویس، سفرنامہ نگار، دانشور اور صوفی ہیں۔ میں ان کے سفرنامے شوق سے پڑھتا ہوں۔ ان کے اندر ایک صوفی ہے وہ جہاں بھی جاتے ہیں اندر چھپا ہوا صوفی ان کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی صنفِ سخن میں لکھیں کمال لکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کی سب سے بڑی خوبصورتی یہی ہے کہ اس میں ہمیں زندگی سے متعلق رہنمائی ملتی ہے۔ نصیحتیں، اقوال، دانش کی باتیں اور دلچسپ قصے ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار کی کتابوں میں ستاروں کی طرح چمکتے ہیں جس سے قاری کو ادبی اور دینی حوالے سے کافی رہنمائی ملتی ہے۔ تصوف ڈاکٹر صاحب کا محبوب موضوع ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں بھی اُن کے صوفیانہ اقوال پر مشتمل ہے۔ اُمید ہے قارئین اس سے فیض یاب ہو کر دنیا اور آخرت کی بھلائی حاصل کریں گے۔

نام کتاب: سورج کا سفر/تحقیق وتدوین: محمد ساجد درانی قادری/صفحات: 128 / قیمت: 220روپے/تبصرہ نگار: آغا تنویر
ناشر: نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

''پروفیسر عاصم ثقلین'' کہتے ہیں نقوی احمد پوری کی تنقید پر ایک طنزیہ رنگ چھایا ہوا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جس شخص پر نقوی بات کر رہے ہیں۔ اس کے لیے یہ طنز بہت زیادہ ہو لیکن نقوی کا لہجہ کہیں بھی تلخ نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسکراتے ہوئے یہ بات لکھ رہے ہیں اور قاری کو بھی مسکرانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ان کی تحریر میں ایک زیرِلب مسکان کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پروین شاکر پر لکھے گئے مضمون میں وہ کئی مقامات پر بہت بڑی بات بڑے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کا اصل نظریہ فن یعنی شاعری پہ بات کریں تو انہوں نے شاعری نہ صرف اپنی مادری زبان سرائیکی میں بلکہ پنجابی اور قومی زبان اردو میں بھی کی ہے۔ ان کی سرائیکی اور اردو زبان پر شاعری کی کتب چھپ چکی ہیں۔ انہوں نے نظم، غزل، گیت، رباعی، منقبت، کافی، دھمال، نعت اور مرثیہ لکھا۔ غرض ہر صنف میں کمال کیا ہے۔ سچائی اور کھرا پن تو اُن کی شخصیت کا خاصہ ہیں ہی مگر ان کا شعر کہنے کا جو انداز اور الگ رنگ ہے اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ نقوی احمد پوری کی نثری جہتیں ہوں یا شاعری، بات کو سمجھانے کا اس اول آویز انداز ملتا ہے کہ جس کی بازگشت صدیوں تک سنی جائے گی اور آنے والی نسلوں کا ہر طالب علم اور علم و ادب کا متلاشی علم کے اس سمندر سے اپنی پیاس بجھائے گا اور رہنمائی حاصل کرتا رہے گا۔

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ پاکستان خاص کر ضلع بہاول پور میں جس طرح نقوی احمد پوری نے علم و ادب کی آبیاری کی ہے صدیوں تک ان کے کاشت کردہ ادبی پھولوں کی مہک دنیا کو مہکاتی رہے گی یا یوں کہوں کہ اس ''سورج'' کی کرنوں کی ضیا زمانے بھر کو منور کرتی رہے گی۔

نام کتاب: نوشتۂ دیوار/شاعر: سید قاسم جلال/صفحات: 144 / قیمت: 300روپے/تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد افتخار شفیع
ناشر: تسکین ذوق پبلی شرز، C-40ماڈل ٹاؤن بہاول پور

ڈاکٹر موصوف نے اپنے قطعات میں معاشرے میں بکھری ہوئی خود غرضیوں کی متعدد دکھ بھری داستانوں کو ان کے پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ پیش کیا ہے اور عوام کے سلگتے مسائل کو فنکارانہ مشاقی سے شعری تجربات کا حصہ بنایا ہے۔ انہوں نے آج کے انسان کے دُکھوں کو بڑے سلیقے سے قطعات کے قالب میں ڈھالا ہے۔ قاسم جلال کا لب ولہجہ چونکہ رجائی ہے اس لیے ان کے کلام کا قاری ان کے افکار کی تفہیم کے بعد اپنے دل میں طمانیت کی ٹھنڈک محسوس کرتا ہے اور یاسیت کے گرداب بلاخیز سے باہر نکل آتا ہے۔ ''نوشتۂ دیوار'' کے قطعات کے موضوعات میں ''وہ سودا ہے محبت، تالیاں اور گالیاں، بے ثباتی، فتح وشکست، پیش بندی اور سیلف میڈ یا گاڈ میڈ'' بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ اگرچہ سیّد قاسم جلال کی صدائے بازگزشت سنائی دیتی ہے لیکن بایں ہمہ وہ ایک صاحب طرز شاعر ہیں اور موضوعات واسلوب کے حوالے سے ان کی انفرادیت فکر ہر ایک شعر سے نمایاں ہے۔ انہوں نے جہاں اُردو شاعری کی کلاسیکی روایات کا بھرپور مطالعہ کیا ہے وہاں جدید دور کے ادب کو بھی گہری نظر سے جانچا اور پرکھا ہے۔ یہ اُن کا اپنا وضع کردہ رنگ سخن ہے جو دیگر شعرا سے بالکل الگ ہے۔ افکار کے حوالے سے بھی ان کا کلام جاندار، پختہ اور سحر انگیز ہے۔ وہ اجتہادِ فکر وفن کے قائل ہیں اور نقادانہ مزاج رکھتے ہیں اسی لیے ادب کے پامال راستوں پر چلنا ان کے لیے مشکل ہے۔ حقیقت نگاری ڈاکٹر سیّد قاسم جلال کے قطعات کا بنیادی موضوع ہے جو ان کے معاصرین کے کلام میں بہت کم نظر آتا ہے۔

نامہ ہائے احباب

السلام علیکم۔ رسالہ خوب صورت ہے۔ اس کی عکس نمایاں قلب حزیں کو تھپکیاں دیتی ہوئی گزرتی ہے۔ نثر دل ربا، شاعری گل رعنا۔ اگر کمپوزنگ کی مار پڑ جائے تو اور بات ہے۔ مضمون بحر جمیل مثمن سالم وجاہت مسعود خوب خاطر جمعی سے لکھا ہے۔ ارژنگ میں عروض نگاری کا سلسلہ دیکھ کر از حد خوشی ہوئی۔ بحر جمیل مثمن سالم کی بھی ایک ہی رہی۔ بحر کی فروعی صورتیں بھی ہوتی ہیں۔ بقولے بحر جمیل مثمن سالم یکا و تنہا کھڑی ہے۔ اظہار مفاعلاتن، مفاعلاتن، مفاعلاتن، مفاعلاتن تقطیع کی آسانی مہیا کرتا ہے۔ تقطیع وقت نظر کی متقاضی ہے۔ دور از کار الجھن میں اسے نہیں ڈالا جاتا۔ وجاہت مسعود کے مضمون سے ''نئے لوگ'' عروض سے مزید بدگمان ہو سکتے ہیں۔ مختلف حوالوں اور آرا بحر جمیل کی گتھی سلجھتی نظر نہیں آتی۔ عروض موزونیت کے جواز بہم پہنچاتا ہے کہ عروض شاعری کی سائنس ہے۔ ''بحر جمیل'' سند خیز نہیں۔ یہ Hypothesis ہے۔ موزونیت کا تعلق ہمیشہ سے حرکات وسکنات سے رہا ہے۔ (زبر، پیش، زیر، سکون) زحاف حرکات وسکنات کے تعینات وضع کرنے سے علاقہ رکھتے ہیں۔ مفاعلاتن کا ابتدائی علاقہ کہیں بھی مقرر و مشہور نہیں۔ مفاعلاتن کے ابتدا سے ''م'' ہٹا دو تو یہ ایک رقبے سے دوسرے خطے میں چلا جاتا ہے۔ شروع میں وتد مجموع سبب خفیف میں ڈھل جاتا ہے۔ اس طرح بحر جمیل مشکوک اور نامنظور سی ہو جاتی ہے۔ حرکات وسکنات کی یکسانی اور برابری ہی سے موزونیت مشکل ہوتی ہے۔ اب ذرا متعلقہ متن اظہاروں کی حیثیت حرکات وسکنات کے اعتبار سے دیکھیں۔

مفاعلاتن، مفاعلاتن، مفاعلاتن، مفاعلاتن (مفاعلاتن) پانچ حرکتیں سکون میں، پانچ حرکتیں سکون میں، پانچ حرکتیں سکون میں، پانچ حرکتیں سکون میں، تین سکون۔ فعل مفعولن، فعل مفعولن، فعل مفعولن، فعل مفعولن (مفعولان) پانچ حرکتیں تین سکون، پانچ حرکتیں تین سکون، پانچ حرکتیں تین سکون، پانچ حرکتیں تین سکون۔

اس ردھم کا مقبول اظہار

فعول فعلن، فعول فعلن، فعول فعلن، مفعول فعلن (فعلان)

پانچ حرکتیں تین سکون، پانچ حرکتیں تین سکون، پانچ حرکتیں تین سکون، پانچ حرکتیں تین سکون۔ یعنی ہر جگہ کل بیس حرکتیں اور بارہ سکون (آخری ہر ایک زیادہ ممکن ہے) جب ان تینوں اظہاروں میں حرکات وسکنات ایک سی موزونیت (ردھم) کے پیدا کار ہیں تو آخری اظہار کو برقرار رکھنے میں کیا قباحت ہے۔ مفاعلاتن کا عروضی سائنسی جواز کیا ہے۔ کبھی کبھی عربی فارسی اظہار کو ہندی آہنگ میں درپیش ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی عجیب مسئلہ نہیں۔ رباعی کے اوزان کے اخرم شجرے کا ایک اظہار ہے۔ مفعولن، مفعولن، مفعولن، فع (فاع)

فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن (فعلان) سے بھی متعلق کہا جا سکتا ہے۔ گویا اس طرح آہنگ ایک ہو گیا۔ فارسی اور ہندی کے قرینے نکل مل گئے۔ مختصراً یہ کہ فعل فعولن (چار بار یک مصرعی کا ابتدائی بحر سے فروعی رشتہ استوار ہے۔ میرے نزدیک مفاعلاتن اس باب میں معذور ہے۔

خیر اندیش

آصف ثاقب

بہت عزیز و محترم حسن عباسی صاحب!

سلامت رہیں۔ السلام علیکم۔ ''ارژنگ'' کا اور میری نظم کی اشاعت کا بہت بہت شکریہ۔ میری پرخلوص دعائیں آپ کے ساتھ رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی کے ساتھ عمر دراز عطا فرمائے! آمین

سلطان سکون

حسن عباسی صاحب! السلام علیکم

ارژنگ کی باقاعدہ اشاعتیں نظر نواز ہوتی رہتی ہیں۔ الحمدللہ کہ آپ کے حسن ذوق ادارت کا لوہا ہر کوئی مانتا ہے۔ گویا آپ اسم با مسمیٰ ہیں۔ پرچہ بھی حسین اور آپ حسن نواز۔ میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ اس میں میری نگارشات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اب

پھر اعادہ کر رہا ہوں۔

ملتان میں آپ کی ہم راہی میں جو عالمی نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا اُس کی یادیں ان مٹ ہیں۔

فقط والسلام

سید ریاض حسین زیدی

محترم و مکرم حسن عباسی صاحب!

مدیر "ارژنگ" لاہور

السلام علیکم۔ اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

تاحال "ارژنگ" سے محروم ہوں۔

حال ہی میں میری کتاب شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب کے دو نسخے آپ کی خدمت میں ارسال ہیں۔ براہ کرم اس کتاب پر اپنے رسالے میں تبصرہ کرا دیں۔ اس سے قبل بھی کتاب ارسال کی تھی لیکن تبصرہ نہیں ہوا۔ اس بار مجھے یاد رکھیں۔ آپ کا دلی طور پر ممنون و شکر گزار رہوں گا۔

آپ کا مخلص

ڈاکٹر سید قاسم جلال

ڈیئر لُبنیٰ صفدر صاحبہ! ماہنامہ "ارژنگ" کی اعزازی مدیرہ ہونے پر آپ کو دلی مبارک باد۔ سلامتی کی دُعائیں۔

"ارژنگ" ایک نہایت عمدہ اور معیاری رسالہ ہے جسے حسن عباسی صاحب اور مدیر اعلیٰ بشمول ٹیم "ارژنگ" نہایت خوش اسلوبی سے ادبی اُفق پر پیش کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنے مقالے اور ارژنگ کے لیے گوشہ مرتب کرنے کے لیے میری کتاب اور غزلیات ارسال کرنے کا پیغام دیا۔ رمضان المبارک کی وجہ سے کتاب ارسال کرنے میں دیر ہو گئی اور آپ کو ان پیج فائل بھی سینڈ نہ ہو سکی۔ دلی معذرت!!

اب بذریعہ ڈاک آپ کو رجسٹرڈ پوسٹ ارسال کر رہی ہوں۔ ملنے پر آگاہ کیجیے گا۔

3 نسبتاً تازہ غزلیں اور کتاب میں سے جو آپ منتخب کرنا چاہیں کر لیجیے گا۔ ارژنگ اور آپ کی ترقی و کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ۔

صائمہ نورین بخاری

ملتان

برادرم حسن عباسی!

السلام علیکم۔ اُمید ہے خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید معیاری صحافتی کام کرنے کی توفیق دیں۔ کافی عرصہ پہلے آپ کے حکم پر کچھ تحریریں ارسال کرنے کی جسارت کی۔ تاحال کوئی اطلاع نہیں ملی۔ آج آپ کا رسالہ سامنے آیا ہے تو سوچا یاد ہی کر لیں۔ کوئی بات نہیں تحریر کہیں شائع ہو ہی جاتی ہے۔ ہوتی بھی رہتی ہیں اصل بات تعلق ہے جو قائم رہنا چاہیے۔ مولا آپ کو اور عزت دیں۔ ایک نعت ارسال کر رہا ہوں کسی قابل ہو تو ٹھیک ورنہ......

امجد شریف

گوجرانوالہ

غزلیں/سعید عاصم

حیف صد حیف کہ وحشت مجھے لے ڈوبی ہے
میں تو سمجھا تھا محبت مجھے لے ڈوبی ہے
شکر ہے ان کے مسائل کا مداوا تو ہوا
جن غریبوں کی حمایت مجھے لے ڈوبی ہے
حاکمِ وقت مجھے کوئی گلہ تجھ سے نہیں
یہ مری خوئے بغاوت مجھے لے ڈوبی ہے
آج پھر میں نے قناعت سے تعلق توڑا
آج پھر ایک ضرورت مجھے لے ڈوبی ہے
دشمنِ جاں سے بھی میں صلح پہ آمادہ ہوں
اپنے آبا کی اطاعت مجھے لے ڈوبی ہے
میں ترے دل میں اُترنے کا ہنر جانتا تھا
لیکن افسوس کہ عجلت مجھے لے ڈوبی ہے
مجھ پہ اک شخص نے کل ہاتھ اُٹھایا ہے سعید
اس کا مطلب ہے شرافت مجھے لے ڈوبی ہے

دشمن ہیں کہیں اور کہیں یار مخالف
صد شکر کہ میرے بھی ہیں دو چار مخالف
کہتے ہیں اُسے جیتنا آساں نہیں ہوتا
جس جنگ میں ہو جائیں طرفدار مخالف
یہ عشق عجب کارِ اذیت ہے کہ اس میں
اپنے ہیں خفا مجھ سے تو اغیار مخالف
کل خوش تھے پر اب دیکھ کے گھبرائے ہوئے ہیں
ہر سمت مری جیت کے آثار مخالف
پستی سے شکایت نہ بلندی سے گلہ ہے
دریا مرے دشمن ہیں نہ کہسار مخالف
تم جیسے مرے ساتھ اُلجھتے ہو مری جاں
ایسے تو کیا کرتے ہیں تکرار مخالف
میں حلقۂ یاراں سے نکلتا ہی نہیں ہوں
کیسے مجھے پہنچائیں گے آزار مخالف
اُس وقت میں ہوتا ہوں سعید اور نمایاں
کرتے ہیں مرے قد سے جب انکار مخالف

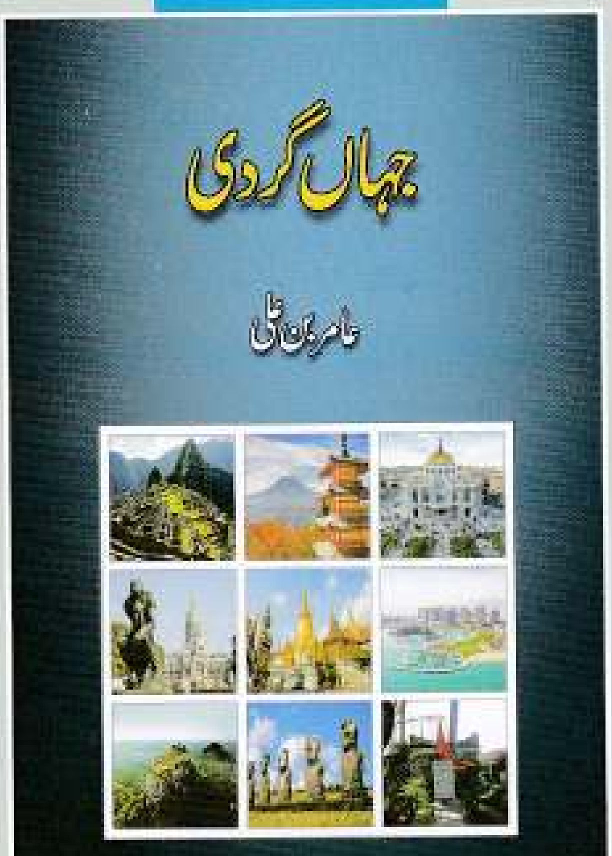

ہم ارژنگ عید ملن مشاعرہ کے پرمسرت موقع پر

نامور شاعر مقبول کالم نگار اور منفرد مترجم

عامر بن علی

کے دوسرے سفرنامے

جہاں گردی

کی خوبصورت اور دیدہ زیب اشاعت اور

تقریب رونمائی

پر

مبارک باد

پیش کرتے ہیں

منجانب: چیئرمین واراکین راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

بلدیہ میاں چنوں کے زیر اہتمام

ماہنامہ ارژنگ اور راوی فاؤنڈیشن کے تعاون سے

عیدملن مشاعرہ

یکم جولائی بروز ہفتہ شام 7 بجے

صدارت : منو بھائی

مہمانانِ خصوصی : عطاء الحق قاسمی • امجد اسلام امجد

نظامت : ڈاکٹر صغرا صدف • وصی شاہ

انور مسعود، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، اختر شمار، اعتبار ساجد، اظہر عنایتی (انڈیا)، اقبال راہی، احسان شاہد (برطانیہ)، امجد اقبال امجد
ایاز محمود ایاز (فرانس)، بسمل صابری، باقی احمد پوری، بابا نجمی، پروین نقش، تیمور حسن تیمور، حسین مجروح، حسن عباسی، حکیم ارشد شہزاد
خالد شریف، خورشید رضوی، خورشید مستانہ، خالد سجاد (کویت)، خالد مسعود خاں، راجا نیر، رخشندہ نوید، رضی الدین رضی، زاہد شمس، سعود عثمانی
سعدیہ صفدر سعدی، سہیل عابدی، سہیل انجم شہزاد، شوکت فہمی (امریکہ)، شاکر حسین شاکر، شکیل جاذب، شاہدہ دلاور شاہ، صوفیہ بیدار، طاہر نسیم
ظفر اقبال، عباس تابش، علینا عترت (انڈیا)، عزیز احمد، علی زریون، علی رضا، عامر سہیل، غافر شہزاد، فاخرہ انجم، فرتاش سید (قطر)، فہیم ضیاء (مسقط)
فاروق طراز (امریکہ)، قمر ریاض (عمان)، قمر رضا شہزاد، کشور ناہید، کرامت بخاری، گل نوخیز اختر، لبنیٰ صفدر، ممتاز راشد، مظہر بخاری، ڈاکٹر محسن مگھیانہ
نیلما ناہید درانی، ندیم بھابھہ، نبیل نجم، نازبٹ، ناصر بشیر، نوید اقبال آکاش، نوید حیدر ہاشمی، ندا فاطمہ، اسد عباس اسد، ابرار ندیم، عامر بن علی

تمام شعراء کرام کے اسمائے گرامی حروفِ تہجی کے اعتبار سے لکھے گئے ہیں

بمقام

سبزہ زار بلدیہ میاں چنوں

برائے رابطہ

ابرار ندیم 0333-4353374 | ڈاکٹر صغرا صدف 0300-9461373 | حسن عباسی 0300-4489310 | عامر بن علی 0345-7410682